شریعت کا مطالعہ

معز امجد

فہرست

شریعت کا مطالعہ ـــــ ہمارا نقطۂ نظر ۹

اخلاص نیت ۱۵

باب المیاہ ۲۲

باب الوضو ۴۳

باب الغسل ۷۸

'مدبّر' کے نام ۱۱۴

باب الیتیم ۱۱۷

باب الحیض والنفاس ۱۴۱

کتاب الطلاق ۱۶۳

تیسری طلاق کے احکام ۲۴۵

دیباچہ

یہ کتاب اسلامی شریعت کے صرف چند مباحث پر مشتمل ہے۔ اسلامی قانون پر تحقیقات کے سلسلے کا یہ ایک نامکمل کام ہے، تاہم اس کام کے دوران میں نہایت اہم مباحث زیر بحث آئے ہیں۔ دین اسلام اور قانون کا ماخذ کیا ہے؟ اجتہاد کا دائرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ دین میں قانون کے ساتھ حکمت کے بیان کی کیا اہمیت ہے؟ یہ اور اس طرح کے سوالات کے جواب اس کتاب کے پہلے مضمون ''شریعت کا مطالعہ ـــــ ہمارا نقطۂ نظر'' میں بیان ہوئے ہیں۔ نیت کا لفظ دینی مباحث میں کن معنی میں آتا ہے اور دین میں اخلاص نیت کی کیا اہمیت ہے؟ یہ سوالات دوسرے مضمون کا موضوع ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب کے باقی حصے میں پانی، وضو، غسل، تیمّم، حیض ونفاس اور طلاق کے بارے میں تفصیل کے ساتھ شریعت بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان مباحث میں شریعت کتنی ہے اور شریعت کی شرح ووضاحت کا عمل دخل کتنا ہے۔

پروردگار سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے مباحث کو ہم سب کے لیے نافع بنا دے۔

المورد، لاہور — معز امجد

۶/ مئی ۲۰۱۰ء

شریعت کا مطالعہ ـــــ ہمارا نقطۂ نظر

دین اسلام میں شریعت یا قانون کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ قرآن مجید نے قانون خداوندی کی تعلیم کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

''وہی ذات ہے، جس نے ان امیوں میں، انھی میں سے ایک رسول بھیجا ہے جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا اور اس طرح ان کا تزکیہ کرتا ہے اور (اس کے لیے) انھیں اللہ کے قانون اور حکمت خداوندی کی تعلیم دیتا ہے[1]۔''

اسلامی شریعت کی اسی اہمیت کے پیش نظر تاریخ کے اوراق میں ابن عمر، ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم، سعید بن جبیر، سعید بن میبّب، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، ابن حنبل اور ابن تیمیہ رحمہم اللہ جیسے جلیل القدر لوگ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے

---

[1] الجمعہ ۶۲:۲۔ 'هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ'۔

سکھائے ہوئے اس قانون کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ لوگ نخل فطرت کے بہترین ثمر ہیں۔ علم وتقویٰ کے معاملے میں یہ اس مقام پر کھڑے ہیں جس تک رسائی آج ہمارے لیے ماورائے تصور ہے۔ ان بزرگوں کے سامنے ہمیں اپنی بے مائیگی کا پورا پورا احساس ہے۔

مگر یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دین کی آخری حجت اب اس زمین پر صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی ذات والا صفات ہے۔ دین، اب صرف اسی چیز کو کہا جا سکتا ہے جسے آپ نے دین قرار دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

> ''آج میں نے تمھارے دین کو تمھارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے تمھارے لیے اسلام کو پسند کر لیا ہے[۲]۔''

چنانچہ، اس تکمیل کے بعد اب رہتی دنیا تک صرف قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہی کو دین کی حیثیت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے، وہ خواہ کسی صحابی کا قول ہو، کسی عالم کی راے ہو، کسی فقیہ کا فتویٰ ہو یا کسی مجتہد کا اجتہاد، ظاہر ہے، قرآن وسنت کی سند کے بغیر اسے دین قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ، ہمارے ان بزرگوں نے نہ کبھی معصوم عن الخطا ہونے کا دعویٰ کیا اور نہ اس تحکم کے ساتھ اپنی بات ہی پیش کی کہ جو کچھ وہ کہہ دیں، اسی کو دین کی حیثیت سے

---

۲ المائدہ ۵: ۳۔ 'اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا'۔

مان لیا جائے۔ اس کے برعکس، واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی ہر بات دلائل ہی کی بنیاد پر پیش کرتے اور دلائل ہی کی بنیاد پر منواتے ہیں۔ بالبداہت واضح ہے کہ اس طریق کار میں ہمیں یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جہاں ہمیں ان کے دلائل مضبوط نظر آئیں، وہاں ہم ان کی بات مان لیں اور کسی معاملے میں، اگر ہمیں ان کے دلائل کمزور محسوس ہوں تو ہم ان سے اختلاف کریں۔ علم کی دنیا میں اس چیز کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے کہ بات کس نے کہی، یہاں اصلاً یہ دیکھا جاتا ہے کہ بات کیا ہے اور کس بنیاد پر کہی گئی ہے۔

خدا گواہ ہے کہ اس کی رحمت و رأفت ہی کے سہارے ہم شریعت اسلامی پر اپنی تحقیقات پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ ہمیں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ ہماری بات ہی صحیح ہے۔ ہم نے اپنی رائے دلائل ہی کی بنیاد پر قائم کرنے اور اپنی بات دلائل ہی کی بنیاد پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اب اختلاف ہم سے نہیں ہمارے دلائل سے ہوگا، اور جب دلیل کی بنیاد پر یہ اختلاف ہوگا تو یقیناً ہمارے دلائل کی کمزوری ہم پر بھی واضح ہو جائے گی۔ اگر بات سمجھ میں آ گئی تو ہمیں، ان شاء اللہ، اپنی رائے سے رجوع کر لینے میں ہرگز کوئی تامل نہ ہوگا۔

اسلامی شریعت سے متعلق ہم یہاں چند باتوں کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں:

ایک یہ کہ قرآن مجید یا سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والی بات ہی شریعت کی حیثیت سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز شریعت اسلامی کا حصہ نہیں ہے۔ یہ ایک نہایت اہم بات ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ معاملات، خواہ فرد سے

متعلق ہوں یا ریاست سے، ان میں شریعت بس اتنی ہی ہے جس کی تعلیم قرآن وسنت سے ہمیں ملتی ہے۔ اس کے بعد انفرادی معاملات میں ہر فرد اور اجتماعی معاملات میں ریاست کی سطح پر بنائے گئے ادارے شریعت کے مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اجتہاد اور تفصیلی قانون سازی کریں گے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکل سکتا ہے کہ دو افراد کے مابین یہ اجتہاد، اور مختلف ادوار میں، ایک ہی اسلامی ریاست کا تفصیلی قانون مختلف ہو۔ مزید براں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ تمام مختلف اجتہاد اور قوانین شریعت اسلامی کے عین مطابق ہوں، مگر یہ بات بہر حال واضح رہے کہ یہ اجتہاد یا یہ تفصیلی قانون سازی ریاست کا قانون تو بن سکتی ہے، شریعت کا حصہ کبھی نہیں بنے گی۔ اوپر ہم نے سورۂ مائدہ کی جس آیت کا ترجمہ نقل کیا ہے، اس سے ہماری اس بات کی تائید ہوتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ جن معاملات میں قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قانون سازی کر دی ہے، ان میں اجتہاد کا کوئی مقام نہیں۔ اجتہاد کا دائرہ اگرچہ نہایت وسیع ہے، مگر یہ قرآن وسنت میں طے کردہ حدود سے آگے شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ آج ہم اجتہاد کر کے نماز کی کوئی نئی ہیئت یا زکوٰۃ کی کوئی نئی شرح مقرر نہیں کر سکتے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی شریعت 'الکتاب' اور 'الحکمۃ' یعنی قوانین اور فلسفے، دونوں کا مجموعہ اور بہترین امتزاج ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ انسان ایک باشعور ہستی ہے۔ لہٰذا اسے اگر کسی حکم میں پائی جانے والی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو اس بات کا

امکان بہت کم ہے کہ وہ پورے دل و جان سے اس حکم کی پیروی کر سکے۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ شریعت اسلامی کی تدوین وتبیین میں ان دونوں ہی جہتوں کا پورا پورا لحاظ کیا جائے۔

اس معاملے میں ہمیں پچھلی امتوں سے سبق لینا چاہیے۔ یہود کا جرم یہ تھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے قوانین کو تمام حکمتوں سے مجرد کر کے ان کے ظاہری احکام کی پابندی ہی کو دین کا منتہا بنا لیا تھا۔ ان کے برخلاف سینٹ پال نے تورات کے قوانین کا انکار کرتے ہوئے نصاریٰ کے لیے اللہ کی شریعت ہی کا انکار کر دیا اور اپنے دین کو ہر قسم کے قوانین سے خالی، چند اخلاقی احکام کا مجموعہ بنا ڈالا۔

چنانچہ، جو شخص بھی شریعت اسلامی کی تدوین یا شرح کا کام کرے، اس پر، جیسا کہ ہم نے بیان کیا، لازم ہے کہ وہ اپنے بیان میں ان دونوں ہی جہتوں کا لحاظ رکھے۔ اگر اسے بیان کرنے میں، اس میں پائی جانے والی حکمت سے چشم پوشی کی گئی تو اس پر یہودیت کا غلبہ ہو جائے گا۔ اس کے برعکس، اگر اسے بیان کرنے میں قوانین کی ظاہری ہیئت کو حکمت پر قربان کیا گیا تو سینٹ پال کی نصرانیت وجود میں آ جائے گی۔ اس بات کے پیش نظر بیان شریعت میں، جہاں ممکن ہو، احکام کی حکمت اور ان کے فلسفے پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے، مگر ظاہر ہے، کوئی انسان اللہ تعالیٰ کے احکام میں پائی جانے والی تمام حکمتوں کا احاطہ نہیں کر سکتا، اس وجہ سے اس معاملے میں اپنے رب کے حضور اہل ایمان کو یہی اعتراف کرنا چاہیے کہ سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا،

اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ[۳]۔

اس کے علاوہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے استنباط کے اصول اور طریق کار پر ان شاء اللہ ہم الگ سے تفصیلی بحث کریں گے۔

[اکتوبر ۱۹۹۵ء]

---

[۳] البقرہ ۲:۳۲۔ ''(اے پروردگار)، تو اس سے پاک ہے (کہ کوئی غیر حکیمانہ کام کرے)، مگر ہمارا علم تو بس اتنا ہی ہے، جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک، تو بے انتہا علم و حکمت والا ہے۔''

اخلاص نیت

نیت کا لفظ عام طور پر دو معنی میں استعمال ہوتا ہے: ایک مجرد ارادہ کے معنی میں اور دوسرے کسی کام کے اصل محرک (Motive) کے معنی میں۔ جب ایک شخص کوئی کام کرتا ہے تو اس کا ارادہ اس کے عمل ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کا تحریر لکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا ارادہ تحریر لکھنے کا ہے۔ اس کے برعکس کسی شخص کے عمل کا محرک یا 'Motive' اس کے عمل ہی سے واضح نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہے تو اس بارے میں تو دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ اس کا ارادہ ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرنے کا ہے، مگر اس کے محرک کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی ہجرت اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے تھی یا کسی دنیوی غرض کے لیے۔

نیت کا لفظ دینی مباحث میں مجرد ارادے کے معنی میں نہیں، بلکہ کسی عمل کے اصل محرک (Motive) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک شخص جو مقررہ اوقات میں اپنے گھر سے نکل کر مسجد کی طرف جاتا اور وہاں پہنچ کر نمازیوں کی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے تو یقیناً اس کا ارادہ، خواہ وہ اسے اپنی زبان سے ادا کرے یا نہ کرے، نماز ہی پڑھنے کا ہے، جبکہ اس کے اس عمل کا محرک اللہ کی رضا جوئی بھی ہو سکتا ہے اور اپنے آپ کو متقی ظاہر کرنا بھی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص دین کا علم حاصل کرتا ہے تو اس کا محرک جہاں صحیح دین کو جاننا اور اس کو دوسروں تک پہنچانا ہو سکتا ہے، وہاں خود کو عالم کی حیثیت سے معاشرے میں منوانا اور مناظرے جیت کر لوگوں کی داد حاصل کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر عمل اپنے پیچھے گوناگوں محرکات رکھ سکتا ہے اور جو محرک بھی اصلاً اس عمل کے پیچھے کارفرما ہوگا، اسی کو اس کی ''نیت'' کہا جائے گا۔

دین میں اخلاص نیت کی اہمیت

اخلاص نیت سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب بھی کوئی کام کرے تو اس کا محرک اللہ تعالیٰ ہی کی رضا جوئی اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنا ہو۔ اس کے علاوہ کوئی اور چیز اس کے پیش نظر نہیں ہونی چاہیے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب بھی اپنے نبی اور رسول بھیجے تو ان کے ذریعے سے لوگوں کو یہی تعلیم دی کہ وہ عبادت و اطاعت کو اللہ ہی کے لیے خاص کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَقِيۡمُوۡا وُجُوۡهَكُمۡ عِنۡدَ كُلِّ مَسۡجِدٍ وَّادۡعُوۡهُ مُخۡلِصِيۡنَ لَهُ الدِّيۡنَ .(الاعراف ۷:۲۹)	''ہر نماز کے وقت اپنا رخ اسی کی طرف کرو، اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے۔''

اسی اخلاص نیت کی تعلیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے دی ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا:

ألأعمال بالنية ولكل امرئ ما نوى فمن كانت هجرته إلى اللّٰه ورسوله فهجرته إلى اللّٰه ورسوله ومن كانت هجرته لدنيا يصيبها أو امرأة يتزوجها فهجرته إلى ما هاجر إليه. (بخاری، رقم ۵۲)	''اعمال (کے اجر) کا انحصار نیت پر ہے۔ اور ہر ایک کے لیے وہی ہے جس کی اس نے نیت کی۔ چنانچہ جو کوئی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے اپنا گھر بار چھوڑے گا تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے ہوگی اور جو دنیوی منفعت یا کسی عورت سے نکاح کے لیے ہجرت کرے گا تو اس کی ہجرت انھی کاموں کے لیے شمار ہوگی جن کے لیے اس نے ہجرت کی۔''

اسی سے متعلق مزید دو روایات ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں:

عن أبی موسٰی قال: جاء رجل إلی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال: الرجل یقاتل للمغنم والرجل یقاتل للذکر والرجل یقاتل لیری مکانہ فمن فی سبیل اللّٰہ؟ قال: من قاتل لتکون کلمة اللّٰہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللّٰہ.
(بخاری، رقم ۲۵۹۹)

''ابو موسیٰ (اشعری رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ کوئی مال غنیمت کے لیے لڑتا ہے، کوئی اپنی شہرت کے لیے اور کوئی جواں مردی دکھانے کے لیے، ان میں سے اللہ کی راہ میں لڑنے والا کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں لڑنے والا وہ ہے جو کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے معرکہ آرا ہو۔''

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: من تعلم علمًا مما یبتغی بہ وجہ اللّٰہ لا یتعلمہ إلا لیصیب بہ عرضًا من الدنیا لم یجد عرف الجنة یوم القیٰمة ...یعنی ریحھا.
(احمد، رقم ۸۱۰۳)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے کوئی ایسا علم حاصل کیا جس سے اللہ کی رضا طلب کی جائے، مگر اس نے اسے دنیا کمانے کے لیے حاصل کیا تو قیامت کے روز وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا۔''

مذکورہ روایات کے علاوہ اسی مضمون کی بہت سی دوسری احادیث اس بات پر قطعی

دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کسی بڑے سے بڑے عمل کی بھی اس وقت تک کوئی وقعت نہیں، جب تک اس عمل کے پیچھے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کا محرک موجود نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اسی عمل کو شرف قبولیت بخشتے ہیں جس میں نیت کا اخلاص موجود ہو، اور اگر نیت کا یہ اخلاص موجود ہو تو بندہ اپنے گھر والوں پر بھی خرچ کرے تو اسے اس کی طرف سے صدقہ گردانا جائے گا اور بیوی کے منہ میں ایک لقمہ ڈالنے کا بھی اسے ثواب حاصل ہوگا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نیت کو زبان سے ادا کیا جائے یا نہیں تو اس بارے میں اصل چیز انسان کا شعوری ارادہ ہے کہ وہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہے۔ البتہ کامل شعور کے ساتھ پڑھے ہوئے کلمات دل کے اس مخفی ارادے کے اظہار کا ذریعہ ہو سکتے ہیں۔ اسی مقصد سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام سے پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھنے کی تعلیم دی اور بہت سے موقعوں کے لیے مختصر، مگر جامع دعائیں سکھائیں تاکہ ایک بندۂ مومن اپنے شب و روز میں مختلف کام سرانجام دیتے ہوئے ان کلمات کو پڑھ کر یہ شعوری جذبہ محسوس کرے کہ اس کا ہر عمل اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔ اسی اخلاص نیت کے اظہار کے لیے آپ نے نماز کے آغاز میں یہ کلمات پڑھے:

وجهت وجهی للذی فطر ''میں نے اپنا رخ، بالکل یکسو ہو کر،

السمٰوٰت و الأرض حنيفًا.	اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور
(نسائی، رقم ۸۸۷-۸۸۸)	زمین کو پیدا کیا۔''

قربانی کرتے وقت یہ کلمات پڑھے:

إن صلاتي و نسكي و محياي	''یقیناً میری نماز، میری قربانی، میری
و مماتي لله رب العٰلمين.	زندگی اور میری موت اللہ رب العٰلمین
(ابن ماجہ، رقم ۳۱۱۲)	ہی کے لیے ہے۔''

اور اسی طرح دیگر مواقع پر اخلاص نیت کے اظہار کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف الفاظ پڑھے، مگر ان کلمات کو یاد کر کے، بغیر سوچے سمجھے ان کا ورد کر دینے سے اخلاص نیت کا اظہار ہرگز نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص زبان سے اپنی نیت کا اظہار کرتا ہے تو اسے چاہیے کہ اول تو وہ انھی مواقع اور اسی طریقے پر یہ اظہار کرے جس پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا کرنا ثابت ہے اور دوم یہ کہ یہ اظہار پورے شعور، توجہ اور دل کی بیداری کے ساتھ کرے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا دل و دماغ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں، جس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کا تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے ہی نہیں۔ یہی بات صاحب ''المغنی''، ابن قدامہ نے اس طرح بیان کی ہے:

و محل النية القلب إذ هي عبارة	''دل محل نیت ہے، جبکہ نیت ارادے
عن القصد و محل القصد	کے ہم معنی ہے اور ارادہ کا محل دل ہی

القلب، فمتى إعتقد بقلبه أجزأه وإن لم يلفظ بلسانه وإن لم تخطر النية بقلبه لم يجزه ولو سبق لسانه إلى غير ما اعتقده لم يمنع ذلك صحت ما اعتقده بقلبه.

(۱۱۱/۱)

ہوتا ہے۔تو جب دل میں پختہ ارادہ موجود ہوتو یہ کافی ہے، اگر چہ زبان سے کوئی کلمات ادا نہ کیے جائیں اور اگر دل میں اخلاص نیت نہیں تو یہ بات جائز نہ ہوگی۔اگر زبان سے وہ کلمات ادا کر دیے جائیں جن کا دل میں پختہ ارادہ موجود نہیں تو آدمی کی نیت وہی ہوگی جو اس کے دل میں موجود ہے نہ کہ وہ جسے اس نے اپنی زبان سے ادا کیا۔''

[۱۹۹۲ء]

باب المیاہ[1]

اس دنیا میں انسان کی ناگزیر ضرورتوں میں سے ایک ضرورت پانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمت انسان کی پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم، کپڑوں اور دیگر اشیا پر لگی ہوئی آلودگیوں کو صاف کرنے اور انھیں دھونے کے لیے بھی ہمیشہ سے استعمال ہوتی آئی ہے۔ چنانچہ جس طرح یہ بات ایک مسلمہ ہے کہ پانی پیاس بجھانے کا ذریعہ ہے، اسی طرح پانی کا انسان کے لیے پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے کا ذریعہ ہونا بھی محتاج دلیل نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بھی پانی کے پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ اس کی صفت پاکیزگی کو بھی ایک مانی ہوئی حقیقت کے طور پر اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی قدرت کی ایک دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ ارشاد باری ہے:

اَلَمۡ تَرَ اِلٰی رَبِّكَ كَيۡفَ مَدَّ ''کیا تم نے اپنے رب کی اس قدرت

---

[1] پانیوں کا باب۔

الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا، وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا، وَهُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَىْ رَحْمَتِهٖ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا، لِّنُحْيِ َ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِىَّ كَثِيْرًا.

(الفرقان ۲۵:۴۵-۴۹)

کی طرف نگاہ نہیں کی کہ کس طرح وہ سایہ پھیلا دیتا ہے اور اگر وہ چاہتا تو اس کو اسی طرح ساکن چھوڑ دیتا، پھر ہم سورج کو اس پر ایک دلیل راہ بناتے ہیں، پھر ہم اس کو آہستہ آہستہ اپنی طرف سمیٹ لیتے ہیں۔ اور وہی ہے جس نے تمھارے لیے شب کو پردہ پوش اور نیند کو دافع کلفت بنایا اور دن کو وقت نشور بنایا۔ اور وہی ہے جو اپنے باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو خوش خبری بنا کر بھیجتا ہے، اور ہم آسمان سے پاکیزہ پانی اتارتے ہیں کہ اس سے مردہ زمین کو از سر نو زندہ کر دیں اور اسے پلائیں اپنی مخلوقات میں سے بہت سے چوپایوں اور انسانوں کو۔''

ان آیات پر غور کیجیے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان میں انسان کے مشاہدات اور اس کی مانی ہوئی حقیقتوں کو اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور اس کی توحید کے دلائل کے

طور پر پیش کیا گیا ہے۔ غرض کہ پانی کی صفت طہور[۲] انسان کی فطرت اور اس کے شعور میں شروع ہی سے موجود ہے اور اس کے ثبوت کے لیے خارج سے کوئی دلیل لانے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیتے ہوئے جب یہ فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ	''اے ایمان والو، جب تم نماز کی
اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ	تیاری کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور
وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا	اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے
بِرُءُوْسِکُمْ وَاَرْجُلَکُمْ اِلَی	سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں
الْکَعْبَیْنِ. (المائدہ ۵:۶)	تک دھولو۔''

اور حالت جنابت کے بارے میں جب یہ حکم دیا:

وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا.	''اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو
(المائدہ ۵:۶)	غسل کرلو۔''

تو انسان اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے لیے کسی دلیل کی ہرگز ضرورت نہیں تھی کہ وضو میں چہرہ، ہاتھ اور پاؤں دھونے کے لیے یا غسل میں پورا جسم دھونے کے لیے اللہ تعالیٰ کی جو نعمت استعمال کی جانی چاہیے، وہ پانی ہی ہے۔ چنانچہ اس آیت کے اگلے حصے میں اس بات کی طرف اشارہ بھی فرمادیا:

---

۲ یعنی یہ کہ پانی پاک ہے اور پاکیزگی کا ذریعہ ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ. (المائدہ ۵:۶)

''اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو۔''

آیۂ مبارکہ کے اس حصے میں اس بات کی تصریح بھی فرمادی کہ اگر پانی نہ ہو تو وضو اور غسل کے بجائے تیمّم کر لینا ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے یہی معنی ہوئے کہ وضو یا غسل کرنے کے لیے پانی ہی استعمال کیا جانا چاہیے۔

اس ساری بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ وضو یا غسل کے لیے انسان ہر وہ چیز استعمال کر سکتا ہے جس پر لفظ 'ماء' یا 'پانی' کا اطلاق ہوتا ہو۔ اس کے برعکس، جس چیز پر 'ماء' کے لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا، اس سے وضو یا غسل کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ پانی کے باب میں اتنی ہی بات شریعت یا قانون سے متعلق ہے، لیکن یہ معاملہ چونکہ عبادات سے تعلق رکھتا ہے، اس وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ لوگ اس میں افراط و تفریط اور غلو کا شکار ہو جائیں۔ لہٰذا اسی بات کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چند اصولی باتوں سے متعلق لوگوں کی رہنمائی فرمادی تاکہ وہ اس معاملے میں بھی اعتدال ہی کی راہ پر قائم رہیں۔ بہ الفاظ دیگر، اس معاملے میں نبی صلی اللہ

علیہ وسلم سے جو رہنمائی ہمیں ملتی ہے، اس کا مقصد شریعت کے حدود و قیود متعین کرنا نہیں ہے، بلکہ، جیسا کہ ہم آگے چل کر ان شاء اللہ واضح کریں گے، اس رہنمائی کا مقصد سرتاسر لوگوں کو ان کی فطرت اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھنا اور انھیں افراط و تفریط سے بچانا ہے۔

دو بنیادی اصول

اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ہمیں جو رہنمائی ملتی ہے، اس پر بحث کا آغاز کرنے سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس مسئلے سے متعلق دو بنیادی اصول واضح کر دیں جن کا، ہر حال میں، خیال رکھا جانا چاہیے:

ایک یہ کہ پانی کے معاملے میں بھی شریعت کا یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ نجس ہے، اسے پاک ہی سمجھا جائے گا اور اس سے وضو یا غسل کرنا، ہر حال میں، جائز ہوگا۔ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں یہی بات اس طرح بیان کی ہے:

ألأصل فی ثوب المسلم، وفی	''مسلمان کے کپڑوں، اس کی زمین
أرضه وفی جسمه الطهارة،	اور اس کے جسم کے بارے میں یہی
حتی یستیقن بالنجاسة فإذا	سمجھا جائے گا کہ وہ پاک ہے، جب

تیقنت وجب غسلها و كذلك الماء أصله أنه محمول على الطهارة حتى يستيقن حلول النجاسة فيه.(۲۶۵/۱)

تک اس بات کا یقین نہ ہوجائے کہ وہ ناپاک ہے۔ پھر جب یہ یقین ہوجائے کہ وہ نجس ہے تو یہ لازم ہے کہ اسے دھویا جائے۔ یہی معاملہ پانی کا بھی ہے۔ اسے ہمیشہ پاک ہی سمجھا جائے گا، الّا یہ کہ اس میں نجاست مل جانے کا یقین ہوجائے۔''

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کو، بلاوجہ، اس شک میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے جس پانی سے وضو یا غسل کیا ہے، وہ پاک تھا بھی یا نہیں۔ مزید یہ کہ اگر پانی کے معاملے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ پاک ہے تو خواہ مخواہ اس تحقیق میں نہیں پڑ جانا چاہیے کہ اس کی پاکیزگی حتمی طور پر ثابت ہوجائے۔ اس طرح کے رویے لوگوں کے لیے تنگی اور بالآخر دین سے متنفر ہوجانے کا باعث بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو وسعت رکھی ہے، ایک فقیہ کو بے کم و کاست اسی وسعت کے ساتھ اسے لوگوں تک پہنچانا چاہیے اور اس معاملے میں ان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ نہ وہ خود افراط و تفریط اور غلو کا شکار ہوں اور نہ دوسروں ہی کو یہ راستہ دکھائیں۔

پانی کے معاملے میں دوسرا بنیادی اصول یہ ہے کہ کسی علاقے یا تمدن کے لوگ جس پانی سے عام طور پر منہ ہاتھ دھوتے یا نہاتے ہوں، وہی پانی وضو یا طہارت کی

غرض سے کیے جانے والے غسل میں بھی استعمال کیا جائے گا۔ اس کے برعکس، کسی علاقے یا تمدن کے لوگ جس پانی سے عام طور پر منہ ہاتھ دھونا یا غسل کرنا پسند نہ کرتے ہوں، انھیں یہ پانی وضو یا شریعت کے مقرر کردہ غسل میں بھی استعمال کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ابن رشد رحمہ اللہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''بدایۃ المجتہد'' میں اسی بات کو یوں بیان کیا ہے:

حد الكراهية عندى هو ما تعافه النفس و ترى أنه ماء خبيث. (۱۹/۱)

''میرے نزدیک (پانی کے معاملے میں) کراہت کا معیار یہ ہے کہ دل اس سے بچنا چاہے اور اسے یہ محسوس ہو کہ پانی گندا ہے۔''

اس سے یہ لازم آئے گا کہ پانی کے معاملے میں کوئی مستقل شریعت یا قانون موجود نہیں ہے، بلکہ اسے تمدن اور عرف ہی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اگر کسی گاؤں میں رہنے والے لوگ جوہڑ کے پانی سے منہ ہاتھ دھو لیتے ہیں تو ان کو اسی پانی سے وضو یا غسل بھی کرنا چاہیے، جبکہ اس کے برعکس کوئی شہری، چونکہ اپنے رہن سہن کے طریقوں اور تمدنی حالات کی وجہ سے اس پانی سے عام طور پر کراہت محسوس کرتا ہے۔ لہٰذا اسے اس پانی سے وضو کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ ظاہر ہے، وضو کر کے آدمی کو نماز ادا کرنی اور اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور جب اس پانی سے اس کی طبیعت ہی ابا محسوس کرتی ہے تو اس سے وضو کر کے آخر اس میں پاکیزگی کا احساس کیسے پیدا ہوگا۔

ان دو اصولوں کو جان لینے کے بعد، اب ہم دیکھتے ہیں کہ پانی کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے۔

سمندر کا پانی

سمندر کا کھارا پانی چونکہ انسان پی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اسے طہارت کے لیے استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ اس معاملے میں اصل بات وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس چیز پر لفظ 'ماء' کا اطلاق ہوگا، اس سے وضو یا غسل کرنا، ہر حال میں، جائز ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سمندر کے پانی پر 'ماء' یا 'پانی' کے لفظ ہی کا اطلاق ہوگا اور اس وجہ سے اس سے وضو یا غسل کرنا جائز ہوگا۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے بھی یہی جواب دیا۔ دارمی کی روایت ہے:

عن أبی هريرة قال: أتى رجال	''ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت
من بنی مدلج إلى رسول الله	ہے کہ بنو مدلج کے چند آدمیوں نے
صلى الله عليه و سلم فقالوا:	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس
يا رسول الله إنا أصحاب هذا	آ کر عرض کی: یارسول اللہ، ہم لوگ
البحر نعالج الصيد على رمث	شکار کی تلاش میں، لکڑی کے تختوں پر
فنعزب فيه الليلة و الليلتين	بیٹھ کر سمندر میں نکل جاتے ہیں اور کئی

والثلاث والأربع، ونحمل معنا من العذب لشفاهنا، فإن نحن توضأنا به خشينا على أنفسنا وإن نحن آثرنا بأنفسنا وتوضأنا من البحر وجدنا في أنفسنا من ذلك فخشينا أن لا يكون طهورًا؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: توضئوا منه فإنه الطاهر ماء ه الحلال ميتته.
(رقم ۷۲۸)

مرتبہ تین چار راتیں سمندر میں رہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بس اتنا ہی پانی ہوتا ہے جو ہمارے ہونٹوں کو تر رکھ سکے، اس وجہ سے اگر ہم اسے وضو کرنے میں استعمال کریں تو یہ ڈر ہوتا ہے کہ ہم پیاس سے مرجائیں اور اگر ہم اس بات کے پیش نظر سمندر کے پانی سے وضو کریں تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ پانی ناپاک نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ان کی بات سن کر) فرمایا: سمندر ہی کے پانی سے وضو کرو، کیونکہ اس کا پانی پاک اور اس کی مری ہوئی چیزیں حلال ہیں۔''

پانی میں نجاست مل جانا

اگر پانی میں معمولی سی نجاست گر جائے تو عام طور پر آدمی اسے نظر انداز کر کے اس پانی کو استعمال کر لیتا ہے۔ یہ رویہ خاص طور پر ان علاقوں میں ضرور اپنایا جاتا ہے، جہاں پانی کی فراہمی آسان نہ ہو اور اس کا بندوبست کرنے کے لیے بہت مشقت

اٹھانی پڑتی ہو، لیکن جب معاملہ وضو یا غسل جنابت کرنے کا ہو تو یہ ہوسکتا ہے کہ غیر معمولی احتیاط کے پیش نظر آدمی ایسا پانی استعمال کرنے سے احتراز کرے اور اس کے لیے ہر مشقت برداشت کر کے دوسرے پانی کا بندوبست کرنے کے لیے نکل کھڑا ہو۔ ہمارے دین میں یہ رویہ ہرگز مطلوب نہیں ہے، کیونکہ اس طرح آدمی اپنے اور دوسروں کے لیے دین کی وسعتوں کو تنگ کرتا اور دین کے ساتھ کشتی لڑنے کی کوشش کرتا ہے، جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ وہ خود بالفرض محال ان تمام تنگیوں اور مشکلات کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر بھی لے، دوسروں کو لامحالہ دین سے متنفر ہی کرنے کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں، وضو یا شریعت کے مقرر کردہ غسل کے لیے آدمی کو وہ پانی بہرحال استعمال کرنا چاہیے جسے وہ عام طور پر استعمال کرتا ہے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے:

عن أبی سعید الخدری قال:	''ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ)
قیل: یارسول اللّٰہ أنتوضأ من	کہتے ہیں: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ
بئر بضاعة وهی بئر یلقی فیها	وسلم) سے پوچھا گیا: کیا ہم بضاعہ
الحیض ولحوم الکلاب	کے کنوئیں سے وضو کر سکتے ہیں؟ یہ
والنتن، فقال رسول اللّٰہ	ایسا کنواں تھا جس میں عورتیں کپڑوں
صلی اللّٰہ علیه وسلم: إن	کے ایسے ٹکڑے پھینک دیا کرتی تھیں

الماء طهور لا ينجسه شئ. (رقم ٦١)

جن پر حیض کا خون لگا ہوتا تھا، اس کے ساتھ ساتھ مرے ہوئے کتے اور بدبودار چیزیں بھی اس میں پھینک دی جاتی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانی ہر حال میں پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی۔''

غور کیجیے تو اس روایت میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خاص طور پر یہ پوچھا گیا ہے کہ کیا اس کنوئیں کے پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کنوئیں پر سے گزرتے ہوئے عام ضروریات کے لیے تو اس کا پانی استعمال کر لیا کرتے تھے، مگر اس پانی سے وضو کرنے میں انھیں تردد تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا یہ تردد دور کر دیا اور بتا دیا کہ جو پانی عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے، اس سے وضو بھی کیا جا سکتا ہے، لیکن بالبداہت واضح ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آدمی غیر محتاط رویہ اختیار کرتے ہوئے اپنی فطرت میں موجود پاکیزگی اور طہارت کی حس ہی کو ختم کر دے یا دبا دے۔ چنانچہ اسی اعتدال کے رویے کو قائم رکھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اس کنوئیں کے پانی سے وضو کرنے کی اجازت دی، وہاں آپ نے غسل کرنے کے یہ آداب بھی سکھائے کہ:

لا تبل فی الماء الدائم الذی ''کھڑے پانی میں پیشاب کر کے

لا یجری ثم تغتسل منه. اسی سے غسل نہ کرلیا کرو۔''
(مسلم، رقم ۴۲۵)

اسی طرح ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یغتسل أحدکم فی الماء الدائم و هو جنب. ''کوئی شخص جنابت کی حالت میں کھڑے پانی میں داخل ہوکر غسل نہ کرے۔''
(مسلم، رقم ۴۲۶)

بالبداہت واضح ہے کہ ایک سلیم الطبع شخص پانی میں رفع حاجت کرنے سے احتراز ہی کرے گا اور غسل کرنے میں یہی طریقہ اختیار کرے گا کہ اپنے جسم پر لگی ہوئی نجاست کو پانی میں داخل ہونے سے پہلے دھولے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ اور اس طرح کی دوسری ہدایات غسل یا وضو کے آداب میں سے ہیں۔ بلاشبہ، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جنابت کی حالت میں اگر آدمی کا ہاتھ بھی پانی میں پڑ جائے تو اس سے پانی ناپاک ہوجائے گا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے وضو کرنے لگے تو امہات المومنین میں سے کسی نے فرمایا: ''میں نے جنابت کی حالت میں اس میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔'' اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا:

الماء لا یجنب. (المغنی ۱۹/۱) ''پانی جنبی نہیں ہوتا۔''

مزید براں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب کسی پانی میں اتنی زیادہ نجاست مل جائے

جس سے اس کے رنگ، بو یا ذائقے میں تبدیلی آجائے تو اس صورت میں انسان کی فطرت اس سے ابا کرتی ہے کہ وہ اسے کسی بھی مقصد کے لیے استعمال کرے، اس وجہ سے ایسے پانی سے وضو یا غسل بھی نہیں کرنا چاہیے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بے جا احتیاط اور غلو سے بچنے کے لیے آپ نے یہ واضح معیار مقرر فرما دیا:

الماء طهور لا ينجسه شئ، إلا ما غلب عليه، فغير طعمه، أو لونه أو ريحه. (التمہید ۳۳۲/۱)

''پانی پاک ہے اور پاکیزگی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، الّا یہ کہ وہ اس پر اتنی غالب آجائے کہ اس کا ذائقہ یا اس کا رنگ یا اس کی بو بدل دے۔''

لیکن اس بات سے ظاہر ہے کہ وہ تمام چیزیں مستثنیٰ ہوں گی، جنھیں انسان خوشبو یا کسی اور مقصد سے پانی میں ملاتا ہے۔ مثال کے طور پر عرق گلاب یا کوئی اور خوشبو ملا پانی پاک ہی ہوگا اور اس وجہ سے اس سے وضو یا غسل کرنا جائز ہوگا۔

جانوروں کا جھوٹا پانی

ایسے پانی کے بارے میں بھی انسان شک میں مبتلا ہو سکتا ہے جس میں سے جانوروں نے پیا ہو۔ یہ مسئلہ خاص طور پر ان جانوروں کے بارے میں پیدا ہوتا ہے جو شریعت

میں حرام ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس معاملے میں اصل بات یہ ہے کہ تمام جانور اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں اور ان میں پایا جانے والا خبث اس اعتبار سے نہیں ہے کہ ان کے چھو دینے سے کوئی چیز ناپاک ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ان جانوروں سے متعلق جس چیز کو حرام قرار دیا گیا ہے، وہ ان کا گوشت کھانا ہے اور اس حرمت کی علت بھی خود قرآن وسنت میں یا عقل وفطرت میں بالکل واضح ہے، اس وجہ سے جانوروں کا جھوٹا پانی ہمارے نزدیک ناپاک نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس طرح کے پانی کو عام طور پر استعمال کرتے ہوں، ان کے لیے اسے وضو یا غسل میں استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے ایسے جوہڑوں کے بارے میں پوچھا گیا جن سے کتے اور دوسرے درندے اپنی پیاس بجھانے آتے تھے کہ ان کے پانی سے وضو کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا:

لها ما حملت فی بطونها ولکم ما غبر شرابًا وطهورًا. (بدایۃ المجتہد ۱/۲۱)

''جو وہ پی گئے، وہ ان کا ہے اور جو باقی رہ گیا، وہ تمھارا ہے۔ تم اسے پی بھی سکتے ہو اور اس سے طہارت بھی حاصل کر سکتے ہو۔''

تاہم، اس معاملے میں یہ بات بہرحال ملحوظ رہنی چاہیے کہ اس طرح کے پانی سے

وضو کرنا جائز ہے، اسے کسی بھی طرح ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ اسے ممنوع ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ دور حاضر میں تمدنی ترقی نے جن علاقوں میں صاف پانی کی فراہمی آسان بنا دی ہے، وہاں کے لوگ اگر اس طرح کا پانی استعمال کرنے میں کراہت محسوس کریں تو ان کو اس پانی سے وضو یا غسل کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

استدراک

اس معاملے میں، البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں کتے کے بارے میں جو ہدایات آئی ہیں، ان سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

عن أبی هريرة أن نبی اللّٰه صلی اللّٰه عليه وسلم قال: إذا ولغ الكلب فی الاناء فاغسلوه سبع مرات والسابعة بالتراب. (رقم ٦٦)	''ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب کتا برتن میں منہ ڈال دے تو اسے سات مرتبہ دھولو، اور ساتویں مرتبہ مٹی لگا کر دھولو۔''

ہمارے نزدیک، کتے کے جھوٹے برتن کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت اس وجہ سے نہیں دی کہ کتے کا جھوٹا ناپاک ہے، بلکہ اس وجہ سے دی ہے کہ اگر کتا پاگل ہو تو اس کی یہ بیماری انسان کو لگ سکتی ہے۔ کتے کے پاگل پن (Rabies)

کی بیماری نہایت خطرناک ہے۔ جب اس بیماری کے جراثیم دماغ تک پہنچ جائیں تو اس کے بعد مریض کا علاج ناممکن ہو جاتا ہے۔

کتے کے جھوٹے سے متعلق ہماری اس رائے کی وجہ یہ ہے کہ اگر معاملہ نجاست ہی کا ہوتا تو اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم برتن کو دھو لینے کی ہدایت فرماتے، جبکہ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں آپ نے غیر معمولی احتیاط کی ہدایت فرماتے ہوئے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم دیا اور یہ بھی فرمایا کہ ساتویں مرتبہ اسے مٹی سے مانج کر دھویا جائے۔

ہوسکتا ہے کسی کے ذہن میں ہماری اس رائے کے خلاف یہ سوال پیدا ہو کہ پاگل کتا تو پانی کے قریب بھی نہیں آتا، اس وجہ سے پاگل کتے کے جھوٹے پانی کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے نزدیک یہ بات بالکل صحیح ہے کہ پاگل کتا پانی کے نزدیک بھی نہیں پھٹکتا، مگر غور کیجیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ روایت میں کتے کا جھوٹا پانی زیر بحث ہی نہیں ہے، اس روایت میں تو کتے کا جھوٹا برتن زیر بحث ہے اور جہاں تک برتن میں منہ ڈالنے کا تعلق ہے، تو وہ بہرحال کوئی کتا اپنے پاگل پن کے باوجود بھی ڈال سکتا ہے۔

اس معاملے میں، البتہ یہ اصولی سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا شریعت کے علاوہ لوگوں کی عمومی تعلیم وتربیت کے لیے بھی ہدایات دیا کرتے تھے؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک قانون دان

اور شارع ہی نہیں تھے، بلکہ آپ کی حیثیت اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے بزرگ، ریاست کے حکمران، ایک مدبر اور حکیم کی بھی ہے۔ چنانچہ احادیث کے ذخیرے پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بہت سے مواقع پر لوگوں کی عمومی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ہدایات دی ہیں جن کا شریعت اور قانون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم یہاں اختصار کے پیش نظر اس طرح کی ہدایات کی دو مثالیں پیش کیے دیتے ہیں:

عن ابن المغفل قال: أمر رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم بقتل الكلاب.

''ابن مغفل بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک مرتبہ) کتوں کو مارنے کا حکم دیا۔''

(مسلم، رقم ۴۲۲، ۲۹۳۹)

ظاہر ہے کہ کتوں کو مارنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں کتوں کے باؤلے پن کی بیماری پھیلنے کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے۔ غالباً اسی زمانے میں آپ نے کتوں کے جھوٹے برتن کو سات یا آٹھ مرتبہ دھونے اور مٹی سے مانجنے کا مذکورہ حکم دیا تھا۔

عن عبد اللّٰه بن سرجس: أن النبى صلى اللّٰه عليه وسلم قال لا يبولن أحدكم فى الجحر وإذا نمتم فأطفئوا

''عبداللہ بن سرجس بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی کسی بل میں پیشاب نہ کرے اور جب تم سونے لگو تو اپنے

السراج فإن الفارة تاخذ الفتيلة فتحرق أهل البيت وأوكئوا الأسقية وخمروا الشراب وغلقوا الأبواب بالليل. (احمد، رقم ۱۹۸۴۷)

چراغ بجھالو، کیونکہ اگر چوہیا چراغ کی بتی پکڑ لے تو (اس سے آگ لگ جائے گی اور) گھر والے جل جائیں گے۔ اور سوتے وقت پانی کی مشک باندھ دیا کرو اور پینے کا پانی ڈھانپ دیا کرو اور رات کے وقت دروازے بند رکھا کرو۔''

ان تمام احکام پر غور کیجیے تو بالبداہت واضح ہے کہ یہ عام زندگی سے متعلق حکیمانہ ہدایات ہیں اور ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کسی کے بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنا

پانی کم ہونے کی وجہ سے ایک آدمی کو مجبوراً کسی دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ عام طور پر کسی کے بچے ہوئے پانی کو استعمال کرنے میں آدمی کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا۔ البتہ جب معاملہ وضو یا غسل کا ہو تو اسے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ پانی پاک ہے بھی یا نہیں؟ چنانچہ، جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، وضو یا غسل کے لیے وہ پانی بہر حال استعمال کیا جا سکتا ہے جسے عام طور پر منہ ہاتھ دھونے یا نہانے کے لیے استعمال کرنے میں آدمی جھجک محسوس نہیں کرتا۔

اوپر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ نقل کر چکے ہیں: 'ألماء طهور لا ينجسه شئ' یعنی پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، جن سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ کسی کے بچے ہوئے پانی کو استعمال کرنے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ ''سنن ابوداؤد'' میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

إغتسل بعض أزواج النبى صلى الله عليه وسلم فى جفنة فجاء النبى صلى الله عليه وسلم ليتوضأ منها أو يغتسل فقالت له: يا رسول الله إنى كنت جنبًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الماء لا يجنب. (رقم ٦٢)	''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے غسل کیا، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنے لگے تو انھوں نے آپ سے کہا: یارسول اللہ، میں جنابت سے تھی، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی جنبی نہیں ہوتا۔''

اسی طرح روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں ایک ہی برتن سے غسل کرلیا کرتے تھے۔ مسلم کی روایت ہے:

كنت أغتسل أنا ورسول الله	''(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی

صلى الله عليه وسلم من إناء بيني وبينه واحد فيبادرني حتى أقول: دع لي دع لي قالت: وهما جنبان. (رقم ۴۸۵)

ہیں کہ) میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے غسل کر لیا کرتے تھے جو ہم دونوں کے درمیان پڑا ہوتا تھا۔[۳] جب آپ جلدی جلدی پانی ڈالتے تو میں کہتی کہ میرے لیے بھی چھوڑ دیں، میرے لیے بھی چھوڑ دیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ اس وقت ہم دونوں حالت جنابت میں ہوتے۔''

شہری زندگی کے موجودہ حالات میں، جبکہ نل کے پانی (Tap water) کی

۳؎ اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی وجہ سے شوہر اور بیوی اکٹھے غسل کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن مجید میں شوہر اور بیوی کے تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ. (البقرہ ۲: ۱۸۷)

''تمھاری بیویاں تمھارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلۂ لباس ہو۔''

قرآن مجید کے ان الفاظ سے جہاں اور بہت سی باتیں نکلتی ہیں، وہاں ایک اہم بات یہ بھی نکلتی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جب نکاح کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں تو ان کے درمیان کسی قسم کا حجاب باقی نہیں رہتا۔

سہولت ہر گھر میں موجود ہے، اگر چہ عام طور پر یہ مسئلہ ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی کے بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنا پڑے، تاہم دیہاتی زندگی میں اب بھی بعض علاقوں میں پانی کی فراہمی ایک مشکل مسئلہ ہے، اس وجہ سے کسی کے استعمال کے بعد بچے ہوئے پانی کو وضو یا غسل میں استعمال کر لینا شریعت میں بہر حال جائز رکھا گیا ہے۔

پانی کے باب میں یہ وہ ہدایات ہیں جو ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتی ہیں۔ ان ہدایات پر غور کرنے سے آدمی بلا تامل اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ان ہدایات کا شریعت یا قانون کے حدود متعین کرنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ہدایات، جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، سرتاسر لوگوں کو اپنی فطرت اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھنے اور اس معاملے میں انھیں افراط و تفریط اور غلو سے بچانے ہی کے لیے دی گئی ہیں۔ ھذا ما عندی و العلم عند اللّٰہ۔

[۱۹۹۴ء]

باب الوضو

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ[1]

فصل ۱: وضو کا طریقہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ. (المائدہ ۵:۶)

''اے ایمان والو، جب تم نماز کی تیاری کے لیے اُٹھو تو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔''

سورۂ مائدہ کی اس آیت سے وضو کے بارے میں بالاجمال جو احکام نکلتے ہیں، وہ

---

[1] البقرہ ۲:۲۲۲۔ ''اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں اور بہت پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔''

یہ ہیں:

۱۔ چہرہ دھونا،

۲۔ ہاتھ کہنیوں تک دھونا،

۳۔ پورے سر کا مسح کرنا،

۴۔ پاؤں ٹخنوں تک دھونا،

۵۔ اعضا کو اسی ترتیب کے ساتھ دھونا جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔

(اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونے کے حکم کے بعد پہلے سر پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے اور پھر پیروں کو ٹخنوں تک دھونے کا، جبکہ اگر ترتیب بیان کرنی پیش نظر نہ ہوتی تو عربیت کی رو سے پاؤں دھونے کا حکم سر پر مسح کے حکم پر مقدم ہوتا۔)

۶۔ اعضا کو لگاتار، یعنی ایک کے بعد ایک اور بغیر وقفے کے دھونا۔

(یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ عربیت کی رو سے حکم جب اس طرح جزا کے اسلوب میں ہو، جس طرح آیۂ زیر بحث میں ہے، تو اس کے تمام معطوفات موالات ہی کے حکم میں ہوتے ہیں، الّا یہ کہ قرینہ اس کے خلاف کسی چیز پر دلالت کرے۔)

اگر کوئی شخص نماز سے پہلے یہی چار اعضا، ان دو شرائط کے ساتھ دھو لیتا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں تو اس نے قرآن مجید کا حکم پورا کر دیا۔ اس کو وضو اور اگر اس نے اس وضو کے ساتھ نماز ادا کر لی ہے تو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لیکن قرآن مجید کے اس حکم پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان تمام اعضا کو حد درجہ اہتمام کے ساتھ دھونا چاہیے۔ وضو دراصل ایک بندے کی اپنے رب کے حضور میں حاضری (نماز) کی تیاری ہے۔ اس اہتمام کی جو صورت عقل وفطرت کے عین مطابق، بلکہ اس کے تقاضوں میں سے ہے، اس کو ہم اختصار سے بیان کرتے ہیں:

ا۔ تسمیہ

تسمیہ کا مطلب 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام سے پہلے یہ کلمات پڑھنے کی تعلیم دی ہے۔ یہ کلمات ایک دعا کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے ذریعے سے پہلے ہی قدم پر انسان متنبہ ہو جاتا ہے کہ جو کام وہ کرنے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات 'رحمٰن' اور 'رحیم' کا سہارا لیتا ہے۔ ان کلمات کے ذریعے سے بندہ اپنے رب سے یہ استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کام میں اس کو برکت عطا فرمائیں اور اس کی غلطیوں سے درگذر فرمائیں۔

باقی تمام کاموں کی طرح وضو سے پہلے بھی یقیناً ہم کو 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنی چاہیے۔ اس بات کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید سے دی

ہے۔

۲۔ وضو سے پہلے ہاتھ دھونا

وضو کرنے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح سے دھو لینا عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔ ہاتھوں ہی سے وضو کے باقی تمام اعضا دھوئے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کو دھونے سے پہلے ہاتھوں کی صفائی کے بارے میں وضو کرنے والے کو تسلی کر لینی چاہیے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل وفطرت کے اسی تقاضے کی وجہ سے یہ فرمایا کہ:

إذا استيقظ أحدكم من نومه فليغسل يده قبل أن يدخلها في وضوئه فإن أحدكم لا يدري أين باتت يده. (بخاری، رقم ۱۵۷)

''جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ وضو کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ان کو دھو لے، کیونکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات بھر کہاں رہا۔''

اس روایت میں ہاتھوں کو دھونے کی وجہ وضو کرنے والے کا نیند سے بیدار ہونا ہی نہیں، بلکہ اس کے ہاتھوں کی صفائی کا غیر یقینی ہونا بھی ہے۔ لہٰذا اس بات کو صرف نیند سے بیدار ہونے والے کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۳۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

ایک سلیم الفطرت انسان جس وقت اپنے چہرے کو پورے اہتمام کے ساتھ دھوتا ہے تو یقیناً وہ اپنے دانت صاف کرتا یا کم از کم اچھی طرح سے کلی کر لیتا ہے اور اپنی

ناک اچھی طرح سے صاف کر لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اسی بات کی تعلیم ملتی ہے۔ آپ جب وضو کرتے تو ہاتھ دھو کر سب سے پہلے کلی کرتے اور پھر ناک میں پانی ڈال کر اسے اچھی طرح سے جھاڑ لیتے تھے۔

۴۔ اعضاے وضو کو اچھی طرح دھونا

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ وضو کے تمام اعضا کو بہت اچھے طریقے سے دھونا بھی اس اہتمام کا لازمی تقاضا ہے جس اہتمام کا وضو کا یہ حکم متقاضی ہے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی رہا کہ آپ اعضاے وضو کو تین تین بار مل کر دھوتے۔ اس کے علاوہ آپ نے وضو کے اعضا کو اچھی طرح دھونے کی تاکید فرمائی ہے، اس ضمن میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

أخبرني عمر بن الخطاب أن رجلاً توضأ فترك موضع ظفر على قدمه فأبصره النبي صلى الله عليه وسلم فقال: ارجع فأحسن وضوءك. (مسلم، رقم ۳۵۹)

''مجھے حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے بتایا کہ ایک شخص نے وضو کیا اور ایک ناخن کے برابر پاؤں سوکھا چھوڑ دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ جاؤ اور اچھی طرح سے وضو کر کے آؤ۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جس میں پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جلدی جلدی اور بے احتیاطی کے ساتھ وضو کرتے دیکھا تو فرمایا:

ویل للأعقاب من النار أسبغوا الوضوء. (مسلم، رقم ۲۴۱) ''بربادی ہے ایڑیوں کی، جہنم کی آگ سے، اچھی طرح سے اور پورا پورا وضو کیا کرو۔''

۵۔ وضو میں داہنے عضو کو پہلے دھونا

کاموں کو دائیں ہاتھ سے کرنے کے بارے میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كان يحب التيمن فى الطهور إذا تطهر وفى ترجله إذا ترجل وفى انتعاله إذا انتعل. (ابن ماجہ، رقم ۳۹۵) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داہنی طرف سے وضو شروع کرنا پسند فرماتے جب بھی وضو کرتے اور اسی طرح کنگھی کرنے میں جب بھی کنگھی کرتے اور جوتا پہننے میں جب بھی جوتا پہنتے۔''

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إذا توضأ تم فابدء وا بميامنكم. (ابن ماجہ، رقم ۳۹۶) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم وضو کرو تو پہلے داہنے اعضا دھویا کرو۔''

کام کرنے سے پہلے 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنے یا کاموں کو دائیں ہاتھ سے شروع کرنے کا تعلق اسلامی معاشرت کی تہذیبی روایات سے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ہم کو اللہ کا دین پہنچایا، اسی طرح ایک صالح معاشرہ بنانے کے لیے تہذیبی روایات دیں اور اس کے آداب واطوار بھی سکھائے۔

خلاصۂ بحث

اوپر کی ساری بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے وضو کی جو بہترین اور کامل ترین صورت سامنے آتی ہے، اس کے اجزا کو بالترتیب ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں:

۱۔ وضو کرنے سے پہلے 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنا۔

۲۔ ہاتھوں کو کلائیوں تک اچھی طرح سے دھو لینا۔ پہلے دایاں ہاتھ دھونا اور پھر بایاں۔

۳۔ مسواک، برش یا انگلی کے ساتھ دانت صاف کرنا یا کم از کم اچھی طرح سے کلی کرنا۔

۴۔ ناک میں پانی ڈال کر اسے اچھی طرح سے جھاڑنا۔

۵۔ بہت اچھی طرح سے چہرہ دھونا۔ چہرے کو اچھی طرح دھونے کے لیے اسے تین مرتبہ دھو لینا چاہیے۔

۶۔ ہاتھوں کو کہنیوں تک تین مرتبہ مل مل کر دھونا۔ پہلے دایاں بازو اور اس کے بعد بایاں۔

۷۔ دونوں ہاتھوں کو بھگو کر، پیشانی کے بالوں سے لے کر گردن کے بالوں تک، پورے سر کا مسح کرنا۔

۸۔ دونوں پیروں کو اچھی طرح سے مل مل کر دھونا۔ پہلے دایاں پاؤں اور اس کے بعد بایاں۔

یہی وہ بہترین اور مبارک طریقہ ہے جس کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا اور جس کی آپ نے تعلیم دی، اس وجہ سے ہم کو عام حالات میں اسی طریقے پر وضو کرنا چاہیے اور اسی طریقے کی لوگوں کو تعلیم دینی چاہیے، لیکن، جیسا کہ ہم یہ بات پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے کوئی شخص اس طریقے کو ملحوظ نہیں رکھتا اور وہی چار اعضا ایک ایک مرتبہ، اسی ترتیب کے ساتھ جو قرآن مجید میں مذکور ہے بغیر کسی وقفے کے دھو لیتا ہے اور اسی وضو سے نماز ادا کر لیتا ہے تو اس نے وضو کا حکم پورا کر دیا۔ اس کو نماز اور وضو کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

فصل ۲: تنبیہات

۱۔ وضو کا ثواب

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی متعدد احادیث مروی ہیں جن میں آپ نے اچھی طرح سے وضو کرنے کا بہت اجر و ثواب بیان فرمایا ہے۔ آپ کے فرمان کے مطابق قیامت کے روز مسلمانوں کی تکریم اور عزت افزائی کے لیے ان کے چہرے اور ہاتھ

پاؤں وضو کرنے کی وجہ سے روشن کیے جائیں گے اور جو شخص جتنا اچھا وضو کرے گا، اس کے یہ اعضا اتنے ہی زیادہ روشن ہوں گے۔[۲]

اہل ایمان کے چہروں کے روشن اور تابناک ہونے کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔

ارشاد ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ، ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ. (عبس ۸۰: ۳۸-۳۹) ''کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، ہشاش بشاش۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اچھی طرح وضو کرے گا اور پھر پورے خضوع وخشوع کے ساتھ نماز ادا کرے گا تو یہ اس کے پچھلے صغیرہ گناہوں کے لیے کفارہ بن جائے گا۔[۳]

۲۔ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا

قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کی جس آیت میں وضو، غسل اور تیمّم کا حکم آیا ہے، وہ آیت ان الفاظ پر ختم ہوئی ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا

---

۲ بخاری، رقم ۱۳۳۔

۳ مسلم، رقم ۳۳۱-۳۳۲، ۳۳۶۔

وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ. (المائدہ ۵:۶)	ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

اس سے یہ بات بڑی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وضو، غسل یا تیمّم کا مقصد اصلاً پاکیزگی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس پاکیزگی کی حالت میں ہے جو شریعت نے اس پر لازم کی ہے تو اس کو وضو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا ضروری نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ہر نماز کے لیے تازہ وضو کیا کرتے تھے۔ اس باب میں ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی ''سنن'' کی ''کتاب الطہارۃ'' میں ایک روایت نقل کی ہے، وہ ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں:

عن أبی غطیف الهذلی قال: سمعت عبد اللّٰه بن عمر بن الخطاب فی مجلسه فی المسجد فلما حضرت الصلٰوة قام فتوضأ و صلی ثم عاد إلی مجلسه فلما حضرت	''ابوغطیف ہذلی کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر بن خطاب کو سنا، جبکہ وہ مسجد نبوی میں اپنی مجلس میں بیٹھے تھے۔ جب نماز کا وقت ہوا تو وہ اٹھے، پھر انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور دوبارہ اپنی نشست پر آ بیٹھے، پھر عصر کا وقت

العصر قام فتوضأ وصلى ثم عاد إلى مجلسه فلما حضرت المغرب قام فتوضأ وصلى ثم عاد إلى مجلسه فقلت: أصلحك اللّٰه أفريضة أم سنة الوضوء عند كل صلوٰة؟ قال: أو فطنت إلى وإلى هٰذا منى؟ فقلت: نعم فقال: لا، لو توضأت لـصلوٰة الصبح لصليت به الصلوٰت كلها مالم أحدث ولكنى سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: من توضأ على كل طهر فله عشر حسنات وإنما رغبت فى الحسنات. (رقم ۵۰۵)

ہوا، اٹھے، انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر آ بیٹھے، پھر جب مغرب کا وقت ہوا تو اٹھے، انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی، پھر واپس آ بیٹھے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اللہ آپ کو خوش رکھے، ہر نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے یا سنت؟ تو انھوں نے پوچھا کہ کیا تم نے میرے عمل سے یہ بات سمجھی؟ میں نے کہا: جی ہاں، انھوں نے کہا: یہ نہ فرض ہے اور نہ سنت۔ اگر میں نے صبح کی نماز کے لیے وضو کیا ہو تو میں اس سے ساری نمازیں ادا کر سکتا ہوں، جب تک میرا وضو ٹوٹ نہ جائے، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص وضو کے ہوتے ہوئے وضو کرے گا تو اس کے لیے دس نیکیاں ہیں۔ اور میں تو نیکیوں ہی کا خواہش مند ہوں۔''

اس سے بھی یہی بات واضح ہوئی کہ تجدید وضو نہ فرض ہے اور نہ سنت۔ اتنی ہی بات کہنی چاہیے جتنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے، یعنی یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کا بہت اجر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس اجر کے حصول کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ وضو کی دعائیں

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مختلف مواقع کے لیے نہایت پاکیزہ اور جامع دعائیں سکھائی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ ان میں سے زیادہ سے زیادہ دعائیں یاد کر کے ان کو موقع کے لحاظ سے پڑھے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دے۔

۱۔ وضو کے بعد یہ دعا کرنی چاہیے:

أشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحده، لا شريك له، وأشهد أن محمدًا عبده، ورسوله، أللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين. (ترمذی، رقم ۵۰)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ، مجھ کو بہت توبہ کرنے والوں اور بہت پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے بنا۔''

۲۔امام مسلم نے اسے اس طرح نقل کیا ہے کہ اس میں سے دعا کا کچھ حصہ حذف ہوگیا ہے:

أشهد أن لا إله إلا الله و أن محمدًا عبد الله، و رسوله. (مسلم، رقم ۳۴۵)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

ہمارے نزدیک امام ترمذی کی روایت میں مکمل دعا نقل ہوئی ہے اور ہمیں اسی کا التزام رکھنا چاہیے۔

فصل ۳: رخصتیں

۱۔ پاؤں دھونے میں رخصت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی سہولت کے لیے یہ رخصت عطا فرمائی کہ اگر کوئی شخص وضو کرتا ہے اور وضو ہی کی حالت میں موزے یا جرابیں پہن لیتا ہے تو اس حال میں وہ اگلا وضو کرتے وقت اپنی جرابوں پر مسح کر سکتا ہے:

عن عروة بن المغيرة عن أبيه قال: كنت مع النبي صلى الله عليه و سلم في سفر فأهويت

''عروہ بن مغیرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ

لأنزع خفيه فقال: دعهما فإني ادخلتهما طاهرتين فمسح عليهما. (بخاری، رقم ۱۹۹)

وسلم کے ساتھ تھا۔ (جب آپ نے وضو کیا) تو میں نے چاہا کہ میں آپ کے موزے اتاروں (تاکہ آپ پاؤں دھولیں) تو آپ نے فرمایا کہ ان کو رہنے دو، میں نے وضو کی حالت میں موزے پہنے تھے، پھر آپ نے ان پر مسح کرلیا۔''

موطا امام مالک میں اس رخصت سے متعلق ایک مفصل روایت نقل ہوئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے موزوں پر مسح کرتے دیکھا تو ان کو یہ بات کچھ اجنبی معلوم ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے سعد رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جب آپ کے والد صاحب یہاں آئیں تو ان سے پوچھیے گا۔ جب یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو جواب میں انھوں نے فرمایا:

إذا أدخلت رجليك في الخفين وهما طاهرتان فامسح عليهما قال عبد اللّٰه: وإن جاء أحدنا من الغائط؟ فقال عمر: نعم وإن

''اگر تم وضو کی حالت میں موزے پہنو تو تم ان پر مسح کر سکتے ہو۔ عبداللہ بن عمر نے دریافت کیا کہ اگر ہم نے رفع حاجت کی ہو تو کیا تب بھی ہم مسح

جاء أحدكم من الغائط. (رقم ٦٥)

کر سکتے ہیں؟ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ ہاں، اگر تم نے رفع حاجت کی ہو تب بھی تم ایسا کر سکتے ہو۔''

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات آئی ہیں، ان میں موزوں اور جرابوں، دونوں کے لیے یہ رخصت ثابت ہوتی ہے۔ سعد بن ابی وقاص، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا۔ ہم یہاں پر اختصار کے پیش نظر صرف ایک روایت نقل کیے دیتے ہیں:

عن عروة بن المغيرة عن أبيه المغيرة بن شعبة عن رسول الله صلى الله عليه و سلم أنه خرج لحاجته فاتبعه المغيرة بإداوة فيها ماء فصب عليه حين فرغ من حاجته فتوضأ و مسح على الخفين. (بخاری، رقم ١٩٦)

''حضرت عروہ بن مغیرہ اپنے والد گرامی مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے لیے نکلے تو مغیرہ پانی کا ایک ڈول لے کر آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جب آپ فارغ ہوئے تو مغیرہ نے آپ کے لیے پانی ڈالا، آپ نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔''

اسی طرح سنن ابن ماجہ میں ایک روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں پر بھی مسح کیا:

عن المغيرة بن شعبة أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم توضأ ومسح على الجوربين والنعلين. (رقم ۵۵۲)	''مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''

یہ بات بظاہر قرآن مجید کے حکم کے خلاف معلوم ہوتی ہے، یعنی یہ کہ قرآن مجید میں تو وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کا حکم ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے کہ پیروں کو دھونے کے بجاے ان پر مسح بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کا قطعی حل ہمارے استاذ جاوید احمد صاحب غامدی نے بیان فرمایا ہے، ہم ان کی تحقیق کا ضروری حصہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس ارشاد[۴] خداوندی سے صاف واضح ہے کہ یہ طہارت جب تک باقی رہے گی، اس وقت تک تازہ وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اسے اگر ایک مرتبہ حاصل

۴؎ 'مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'، ''اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کریں، بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں پاک کریں اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دیں تاکہ تم ان کے شکر گزار ہو۔'' (المائدہ ۵: ۶)

کرلیا جائے تو یہ کب تک باقی رہتی ہے؟ اس سوال کا مفصل جواب ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ملتا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ جب تک پاخانے کی راہ سے ہوا خارج نہ ہو یا آدمی رفع حاجت کے لیے نہ جائے یا بیوی کے قریب نہ ہو، یا سو نہ جائے، اس وقت تک یہ طہارت لازماً قائم رہتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ نے بتائی ہے کہ وضو کے بعد اگر جراب پہن لی جائے تو پیروں کی طہارت ان نواقض کے پیش آجانے سے بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس صورت میں یہی کافی ہے کہ اس کی علامت کے طور پر ان کا مسح کرلیا جائے۔ یہ سب، بالبداہت واضح ہے کہ اس علت کا بیان ہے، جس پر وضو کا یہ حکم خود قرآن مجید کی رو سے مبنی ہے۔ اس سے قرآن کے مدعا میں کسی نوعیت کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔''

(ماہنامہ اشراق، مئی ۱۹۹۰ء، ۶۵-۶۶)

اس رخصت کی مدت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مسافر کے لیے تین روز تک اور مقیم کے لیے ایک روز پیروں پر مسح کرنے کی اجازت ہے:

عن شريح بن هانئ قال: أتيت	''شریح بن ہانی کہتے ہیں کہ میں
عـائشة أسئلها عن المسح	حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے
على الخفين فقالت: عليك	پاس گیا اور ان سے پیروں پر مسح
بإبن أبي طالب فاسئله فإنه	(کی مدت) کے بارے میں پوچھا تو
كـان يسافر مـع رسول الله	انھوں نے فرمایا کہ اس بارے میں تم

صلى الله عليه وسلم فسئلناه فقال: جعل رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاثة أيام ولياليهن للمسافر ويومًا وليلة للمقيم. (مسلم، رقم ۴۱۴)

حضرت علی سے پوچھ لو، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حضرت علی سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے تین دن اور تین راتوں تک اور مقیم کے لیے ایک دن اور رات تک پیروں پر مسح کرنے کی اجازت دی ہے۔''

۲۔ سر پر مسح کرنے میں رخصت

جرابوں پر مسح کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رخصت بھی دی ہے کہ اگر کسی شخص نے وضو کی حالت میں عمامہ یا پگڑی باندھ رکھی ہے تو وہ اس کو اتارے بغیر اسی کے اوپر مسح کر سکتا ہے:

عن ابن المغيرة عن أبيه أن النبى صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين ومقدم راسه وعلى عمامته. (مسلم، رقم ۴۱۱)

''حضرت ابن مغیرہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (وضو میں) موزوں پر مسح کیا اور اپنے سر کے اگلے حصے پر اور اپنے عمامے پر مسح کیا۔''

ہمارے نزدیک اس کی تفصیل بھی وہی ہے جو پیروں کے مسح کی اجازت میں ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

فصل ۴: نواقض وضو

یہ بات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ وضو کے ہوتے ہوئے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ضروری نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن کے واقع ہونے کے بعد تازہ وضو کرنا ضروری ہے؟ انھی چیزوں کو 'نواقض وضو' کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن همام بن منبه أنه سمع أبا هريرة يقول: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم: لا تقبل صلٰوة من أحدث حتى يتوضأ. (بخاری، رقم ۱۳۲)

''ہمام بن منبہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو 'حدث' لاحق ہو جائے، اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک وہ وضو نہ کر لے۔''

اس 'حدث' کی وہ تفصیل جو ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ سے ملتی ہے، اس کے مطابق یہ چیزیں وضو کی نواقض ہیں:

۱۔ ریح کا اخراج،

۲۔ پیشاب کرنا،

۳۔ پاخانہ کرنا،

۴۔ مذی* کا اخراج،

۵۔ منی کا اخراج،

۶۔ جماع کرنا۔

ان میں سے آخری دو کے واقع ہونے سے وضو تو ٹوٹ جائے گا، مگر طہارت حاصل کرنے کے لیے اب صرف وضو کافی نہ ہوگا، بلکہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا۔

مذی کے خارج ہونے اور پیشاب اور پاخانہ کرنے کی صورت میں اپنی شرم گاہ کو دھو لینا چاہیے اور اگر پانی نہ ہو یا اس کی قلت ہو تو اپنی شرم گاہ کو خشک ڈھیلوں سے صاف کر لینا چاہیے۔ اس زمانے میں پانی نہ ہونے کی صورت میں ٹشو پیپر (Tissue Paper) بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر سبیلین (یعنی انسانی جسم سے نجاست کے اخراج کے دونوں راستوں) سے کسی اور چیز کا اخراج ہو، مثلاً اگر پیشاب کے راستے سے پتھری نکلے تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے ساتھ عام طور سے نجاست بھی لگی ہوتی ہے۔

---

* مذی سے مراد وہ سیال مادہ ہے جو شہوت کے وقت شرم گاہ سے خارج ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں وضو کے نواقض صرف ضمنی طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ	''اے ایمان والو، جب تم نماز کی
اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ	تیاری کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا	اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوو اور اپنے
بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى	سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں
الْكَعْبَيْنِ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا	تک دھوو۔ اور اگر تم حالت جنابت
فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى	میں ہو تو غسل کرلو، اور اگر تم مریض
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ	ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی
مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ	جائے ضرور سے آیا ہو یا تم نے عورتوں
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا	سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ	پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے
وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ	ہاتھوں پر اس سے مسح کرلو، اللہ یہ نہیں
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ	چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ	کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.	پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام
	کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔''

اس آیت سے بالترتیب یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ یہ کہ عام حالات میں، اگر آدمی کا وضو نہیں ہے تو اسے نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

۲۔ یہ کہ آدمی اگر جنابت کی حالت میں ہے تو نماز کے لیے اسے وضو نہیں، بلکہ اچھی طرح غسل کرنا ہوگا۔

۳۔ یہ کہ سفر، مرض یا پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم* کر سکتا ہے، خواہ اسے طہارت حاصل کرنے کے لیے وضو کی ضرورت ہو یا غسل کی (یعنی یہ کہ خواہ اس نے رفع حاجت کی ہو یا جماع)۔

۴۔ یہ کہ وضو، غسل اور تیمّم کے حکم سے منشائے خداوندی ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے لیے کسی قسم کی تنگی پیدا کی جائے، بلکہ اس سے انھی کو پاکیزہ بنانا مقصود ہے۔

اس آیت کے پہلے حصے 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ... فَاطَّهَّرُوْا' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وضو ٹوٹنے کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ جس کے بعد دوبارہ طہارت حاصل کرنے کے لیے وضو کرنا ضروری ہے اور دوسری وہ جس کے بعد وضو کافی نہیں، بلکہ غسل کرنا ہوگا۔ آیت کے آخری حصے 'وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى ... لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں انھی دونوں صورتوں کی بڑی بڑی مثالیں دے کر یہ بتا دیا گیا ہے کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں، دونوں ہی حالتوں میں تیمّم کیا جا سکتا ہے۔

---

* تیمّم: پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت حاصل کرنے کا طریقہ۔ تیمّم پر مفصل بحث ''باب التیمم'' میں آئے گی۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' والا حصہ نواقض وضو کا بیان نہیں ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تیمّم کون کون سی صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر اگر 'اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' کا حصہ نہ ہوتا تو اس صورت میں یہ مسئلہ لازماً پیدا ہوتا کہ اگر آدمی جنبی ہے تو اسے غسل ہی کرنا پڑے گا اور پانی نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ تیمّم نہیں کر سکتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ذریعے سے نواقض وضو کی انھی دو صورتوں کی تفصیل امت کو منتقل کی۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، پاخانہ، پیشاب اور ریح کا اخراج پہلی صورت کی تفصیل اور اس کے لواحق کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ جماع، منی اور مذی کا اخراج دوسری صورت کی تفصیل اور اس کے لواحق ہیں۔

خبر آحاد* سے نواقض وضو کی تفصیل

خبر آحاد سے نواقض وضو کے بارے میں جو تفصیل ملتی ہے، وہ ہم یہاں ایک ترتیب کے ساتھ درج کیے دیتے ہیں:

۱۔ نیند

سونے سے چونکہ وضو کے ٹوٹنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات عقل و

* خبر واحد سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جسے راویوں کی اتنی تعداد نے بیان نہ کیا ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ اس میں کسی شک کی گنجایش باقی نہیں رہی۔

فطرت کے عین مطابق ہے کہ آدمی سو کر اٹھنے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو کرلے۔ یہی بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی۔ آپ کا ارشاد ہے:

عن علی بن أبی طالب رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: وکاء السه العینان فمن نام فلیتوضأ. (ابوداؤد، رقم ۴۷۰)

''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (جاگتی) آنکھیں دبر (سے خارج ہونے والی ریح) پر محافظ ہیں۔ چنانچہ جو سو گیا، اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرلے۔''

اس روایت سے یہ بات پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کا سونا یا اس پر نیند کا غلبہ پالینا بذات خود ناقض وضو نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو نیند سے بیدار ہونے کے بعد، نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آدمی اگر ایسی نیند سویا ہے کہ اس کو اپنی طہارت کے بارے میں پورا یقین ہے (مثال کے طور پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جانا) تو اس کو دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح کی بات اس روایت میں بھی بیان ہوئی ہے:

عن أنس بن مالك قال: کان

''انس بن مالک روایت کرتے ہیں

أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینامون ثم یقومون فیصلون ولا یتوضئون.

کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوجایا کرتے، پھر اٹھتے اور وضو کیے بغیر نماز ادا کر لیتے۔''

(ترمذی، رقم ۷۳)

اسی طرح روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہو کر وضو کیے بغیر نماز ادا کر لیتے۔ اس بات کا جواب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دیا:

قالت عائشة رضی اللّٰہ عنہا: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: تنام عیناي ولا ینام قلبی. (ابوداؤد، رقم ۱۷۴)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔''

۲۔ شک میں رخصت

نماز کے دوران میں اگر کسی شخص کو یہ شک ہو جائے کہ وہ وضو سے ہے یا نہیں تو اسے اس وقت تک تازہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں، جب تک کہ اسے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔

اس باب میں امام مسلم اپنی ''صحیح'' کی ''کتاب الطہارۃ'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إذا وجد أحدکم فی بطنہ شیئًا فأشکل علیہ أخرج منہ شیٔ أم لا فلا یخرجن من المسجد حتی یسمع صوتًا أو یجد ریحًا. (مسلم، رقم ۵۴۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں کوئی چیز (یعنی ریح) محسوس کرے اور اس کو یہ یقین نہ ہو کہ وہ خارج ہوئی ہے یا نہیں تو وہ مسجد سے (وضو کرنے کے لیے) نہ نکلے، جب تک وہ آواز نہ سن لے یا بدبو نہ محسوس کر لے (یعنی اس کو ہوا خارج ہونے کا یقین نہ ہو جائے)۔''

۳۔ بیماری میں رخصت

اگر کسی شخص کو ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے سبیلین سے کوئی چیز خارج ہوتی رہتی ہو تو اس صورت میں اس کو ہر نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر نماز کے دوران میں اس کو یہ چیز خارج ہوتی محسوس ہو تو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رخصت کی اساس قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے خود قرآن ہی کی رو سے ایک استثنا کے ساتھ مشروط ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ۲:۲۳۳)

''کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلّف نہیں ٹھہرایا جاتا۔''

اسی طرح وضو، غسل اور تیمّم کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

اس قسم کی بیماری میں یہ رخصت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری نے یہ روایت نقل کی ہے:

هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت: جاء ت فاطمة بنت أبى حبيش إلى النبى صلى اللّٰه عليه و سلم فقالت: يارسول اللّٰه إنى إمرأة أستحاض فلا أطهر أفأد ع الصلٰوة؟ فقال

''ہشام بن عروہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ، مجھے استحاضہ ہے۔ چنانچہ میں کبھی پاک

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: لا إنما ذلك عرق ولیس بحیض فإذا أقبلت حیضتك فدعی الصلٰوۃ و إذا أدبرت فاغسلی عنك الدم ثم صلی قال: وقال أبی: ثم توضئی لکل صلٰوۃ حتی یجیٔ ذلك الوقت. (بخاری، رقم ۲۲۱)

نہیں ہوتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، نماز مت چھوڑو، یہ تو صرف ایک رگ (کا خون) ہے، یہ حیض نہیں ہے۔ جب تمھیں حیض شروع ہو تو نماز چھوڑ دو اور جب ختم ہو جائے تو خون دھولو اور پھر نماز پڑھو۔ (ہشام اپنے والد عروہ کے حوالے سے) کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: پھر ہر نماز کے لیے وضو کر لیا کرو، یہاں تک کہ پھر حیض کے ایام آ جائیں۔''

۴۔نواقض ـــــ چند اختلافات

روایات سے جن مزید نواقض کا علم ہوتا ہے، ان میں امت کا اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر خون کے بہنے سے، قے یا نکسیر سے، آگ پر پکے ہوئے کھانے اور اونٹ کا گوشت کھانے سے، عورت کو چھونے سے، شرم گاہ چھونے سے یا نماز کے دوران میں قہقہہ لگانے سے وضو کا ٹوٹنا وغیرہ۔ ان تمام معاملات میں دونوں قسم کی روایات موجود ہیں: ایک وہ جن سے یہ چیزیں وضو کی ناقض معلوم ہوتی ہیں۔ اور دوسری وہ جن سے

اس کے برعکس بات معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات میں ترجیح کے لیے ہمارے نزدیک اگرچہ یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید نے اس باب میں جو دو اصول (اگرچہ ضمنی طور پر ہی سہی) 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ' اور 'لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' کی صورت میں بیان کر دیے ہیں، ان سے متجاوز کوئی روایت کسی حال میں قبول نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان روایات کی حیثیت بھی ہم یہاں واضح کیے دیتے ہیں۔

نماز کے دوران میں قہقہے سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی کتاب ''اعلاء السنن'' میں بہت سی روایات نقل کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

عن أبی موسٰی رضی اللّٰہ عنہ قال: بینما رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یصلی إذا دخل رجل فتردی فی حفرة کانت فی المسجد، وکان ببصرہ ضرر، فضحك کثیر من القوم وھم فی الصلاة، فأمر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من	''ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک آدمی آیا، جس کی آنکھوں میں نقص تھا اور ایک گڑھے میں گر گیا جو مسجد میں تھا۔ اس پر بہت سے لوگ نماز کے دوران میں ہنس پڑے۔ جو لوگ ہنسے تھے، ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دیا کہ وہ دوبارہ وضو کر کے آئیں اور

ضحك أن يعيد الوضوء ويعيد الصلوٰة رواه الطبراني في الكبير. (کتاب الطہارۃ: باب نقض الوضو من القہقہۃ فی الصلوٰۃ)

اپنی نماز دہرائیں۔ یہ طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں روایت کیا ہے۔''

جن روایات سے نماز کے دوران میں قہقہہ مارنے سے وضو کا ٹوٹنا ثابت ہوتا ہے، ان کے بارے میں ابن قدامہ ''المغنی'' میں لکھتے ہیں:

وروى من غير طريق أبي العالية بأسانيد ضعاف. وحاصله يرجع إلى أبي العالية ... ومارووه مرسل لا يثبت وقد قال ابن سيرين: لا تاخذوا بمراسيل الحسن وأبي العالية فإنهما لا يباليان عمن أخذا. (۱۱۶/۱)

''ابوالعالیہ کے (طریقہ کے) علاوہ یہ روایت سند کے ضعف کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ ابوالعالیہ ہی کی سند کے ساتھ ہے... اور جو وہ روایت کرتے ہیں، وہ مرسل ہے اور ثابت نہیں ہے۔ ابن سیرین نے کہا ہے کہ حسن اور ابوالعالیہ کی مرسل روایتیں مت لو، کیونکہ وہ دونوں حضرات اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ کس سے روایت قبول کر رہے ہیں۔''

ابن حزم ان روایات کے بارے میں فرماتے ہیں:

وأما الضحك في الصلوٰة فإنا روينا في إيجاب الوضوء منه أثرا واهيًا لا يصح. لأنه إما مرسل من طريق أبي العالية وإبراهيم النخعي وإبن سيرين والزهري وعن الحسن عن معبد بن صبيح ومعبد الجهني وإما مسند من طريق أنس وأبي موسٰى وأبي هريرة وعمران بن حصين وجابر وأبي المليح، وروينا إيجاب الوضوء منه عن أبي موسٰى الأشعري وإبراهيم النخعي والشعبي وسفيان الثوري والأوزاعي والحسن بن حي وعبيد اللّٰه بن الحسن وأبي حنيفة وأصحابه. فأما حديث أنس فإنه من طريق أحمد بن

”جہاں تک نماز میں ہنسنے کا تعلق ہے تو ہم نے اس سے وضو کے واجب ہونے میں چند کمزور روایات نقل کر دی ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اس لیے کہ یا تو وہ ابوالعالیہ، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، زہری، حسن، معبد بن صبیح، معبد الجہنی سے مرسل ہیں اور یا انس، ابوموسیٰ، ابوہریرہ، عمران بن حصین، جابر، اور ابوالملیح سے مسند ہیں۔ ان (مسند روایات) میں سے ہم نے جن میں وضو کا واجب ہونا نقل کیا ہے، وہ ابوموسیٰ اشعری، ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، عبیداللہ بن حسن، ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں سے ہیں۔ انس کی روایت جو کہ احمد بن عبداللہ بن زیاد تستری اور عبدالرحمٰن بن عمر کے طریق سے مروی ہے، اس میں ابوحیلہ ہیں جو مجہول ہیں۔

عبد اللّٰه بن زياد التترى عن عبد الرحمن بن عمر وأبى حيلة وهو مجهول، وأما حديث أبى موسٰى ففيه محمد بن نعيم وهو مجهول، وأما حديث أبى هريرة ففيه عبد الكريم بن أبى المخارق وهو غير ثقة وأما حديث عمران بن حصين ففيه إسماعيل بن عياش وعبد الوهاب بن نجدة وهما ضعيفان، وأما حديث جابر ففيه أبو سفيان وهو ضعيف وأما حديث أبى المليح ففيه الحسن بن دينار وهو مذكور بالكذب.

(المحلّٰی ۱/۲۶۴-۲۶۵)

ابوموسیٰ کی روایت میں محمد بن نعیم ہیں جو مجہول ہیں۔ابوہریرہ کی روایت میں عبدالکریم بن ابی المخارق ہیں جو غیر ثقہ ہیں۔عمران بن حصین کی روایت میں اسماعیل بن عیاش اور عبدالوہاب بن نجدہ ہیں اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔جابر کی روایت میں ابوسفیان ہیں جو ضعیف ہیں۔ابوالملیح کی روایت میں حسن بن دینار ہیں جن کو جھوٹا کہا گیا ہے۔''

''المغنی'' اور ''المحلّٰی'' کے ان اقتباسات کی روشنی میں ہم قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کی مذکورہ روایات کو اس بات کے لیے ناکافی سمجھتے ہیں کہ ان کی بنیاد پر قہقہہ کو ناقض وضو

قرار دیا جائے۔

نکسیر پھوٹنے، قے ہونے، کھانا کھانے، جسم سے خون کے بہنے یا اس طرح کی دوسری چیزوں سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں جو روایات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، ان میں فعل 'توضأ' سے مراد کلی کر لینا یا ہاتھ منہ دھو لینا ہے۔

عربی زبان میں ایک فعل، جیسے ارادۂ فعل یا انتہائے فعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ویسے ہی مکمل فعل کے کسی جز پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ یہی بات ابن اثیر نے بھی کہی ہے، وہ کہتے ہیں:

وقد يراد به غسل بعضًا لأعضاء ومنه الحديث: توضئوا مما غيرت النار، أراد به غسل الأيدى والأفواه من الزهومة، ... ومن حديث قتادة: من غسل يده فقد توضأ.
(النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ۸۵۶/۲)

''اس سے مراد کبھی کبھی (پورا وضو کرنے کے بجائے) کچھ اعضا کو دھو لینا ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں سے وضو کر لیا کرو، اس سے مراد ہاتھوں اور منہ سے چکنائی اور بساند کا دھونا ہے، ... اسی طرح قتادہ کہتے ہیں کہ جس نے اپنا ہاتھ دھویا، اس پر فعل 'توضأ' کا اطلاق ہو سکتا ہے۔''

عورت کو چھونے سے وضو کے ساقط ہونے کے بارے میں صحابہ ہی کے زمانے

سے اختلاف رہا ہے۔ عبداللہ بن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے نزدیک عورت کو چھونے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے، جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ضروری نہیں۔

اس اختلاف کی وجہ قرآن مجید کا ارشاد 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' کے معنی کے تعین کا اختلاف ہے۔ 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' کے لغوی معنی، بلاشبہ عورت کو چھونے ہی کے ہیں، مگر ہمارے نزدیک یہاں پر یہ کنایۃً استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد 'جماع' کرنا ہے، نہ کہ محض چھونا۔ عربی زبان میں اس کا یہ استعمال معروف ہے۔ صاحب ''لسان العرب'' 'لمس' کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: 'اللمس کناية عن الجماع' ('لمس' کو کنایۃً 'جماع' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے)۔ صاحب ''کشاف'' نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' سے پہلے 'اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ' بھی ایسا ہی اسلوب ہے جس کے معنی رفع حاجت کرنے کے ہیں نہ کہ جائے ضرور سے ہو آنے کے۔

ہمارے نزدیک عورت کو محض چھونے سے وضو ساقط نہیں ہوتا۔ ہماری اس رائے کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی ہوتی ہے جس کو ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے ایک روایت میں بیان کیا ہے:

إن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج

قبل إمرأة من نسائه ثم خرج إلى الصلوة ولم يتوضأ.

میں سے کسی کا بوسہ لیتے اور نماز کے لیے جاتے تو وضو نہ کرتے تھے۔''

(ابوداؤد، رقم ۱۵۳)

[۱۹۹۲ء]

باب الوضو

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ[1]

فصل ۱: وضو کا طریقہ

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَی الْكَعْبَیْنِ. (المائدہ ۵:۶)

''اے ایمان والو، جب تم نماز کی تیاری کے لیے اُٹھو تو اپنے چہرے اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھولو اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھولو۔''

سورۂ مائدہ کی اس آیت سے وضو کے بارے میں بالاجمال جو احکام نکلتے ہیں، وہ

---

[1] البقرہ ۲:۲۲۲۔ ''اللہ تعالیٰ بہت توبہ کرنے والوں اور بہت پاکیزہ رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔''

یہ ہیں:

۱۔ چہرہ دھونا،

۲۔ ہاتھ کہنیوں تک دھونا،

۳۔ پورے سر کا مسح کرنا،

۴۔ پاؤں ٹخنوں تک دھونا،

۵۔ اعضا کو اسی ترتیب کے ساتھ دھونا جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔

(اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونے کے حکم کے بعد پہلے سر پر مسح کرنے کا حکم دیا ہے اور پھر پیروں کو ٹخنوں تک دھونے کا، جبکہ اگر ترتیب بیان کرنی پیش نظر نہ ہوتی تو عربیت کی رو سے پاؤں دھونے کا حکم سر پر مسح کے حکم پر مقدم ہوتا۔)

۶۔ اعضا کو لگاتار، یعنی ایک کے بعد ایک اور بغیر وقفے کے دھونا۔

(یہ اس وجہ سے ضروری ہے کہ عربیت کی رو سے حکم جب اس طرح جزا کے اسلوب میں ہو، جس طرح آیۂ زیر بحث میں ہے، تو اس کے تمام معطوفات موالات ہی کے حکم میں ہوتے ہیں، الّا یہ کہ قرینہ اس کے خلاف کسی چیز پر دلالت کرے۔)

اگر کوئی شخص نماز سے پہلے یہی چار اعضا، ان دو شرائط کے ساتھ دھو لیتا ہے جو قرآن مجید میں مذکور ہیں تو اس نے قرآن مجید کا حکم پورا کر دیا۔ اس کو وضو اور اگر اس نے اس وضو کے ساتھ نماز ادا کر لی ہے تو نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

لیکن قرآن مجید کے اس حکم پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان تمام اعضا کو حد درجہ اہتمام کے ساتھ دھونا چاہیے۔ وضو دراصل ایک بندے کی اپنے رب کے حضور میں حاضری (نماز) کی تیاری ہے۔ اس اہتمام کی جو صورت عقل وفطرت کے عین مطابق، بلکہ اس کے تقاضوں میں سے ہے، اس کو ہم اختصار سے بیان کرتے ہیں:

ا۔ تسمیہ

تسمیہ کا مطلب 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر کام سے پہلے یہ کلمات پڑھنے کی تعلیم دی ہے۔ یہ کلمات ایک دعا کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے ذریعے سے پہلے ہی قدم پر انسان متنبہ ہو جاتا ہے کہ جو کام وہ کرنے والا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی پسند کے مطابق اور اس کے احکام کے تحت ہی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کلمات کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کی دو عظیم صفات 'رحمٰن' اور 'رحیم' کا سہارا لیتا ہے۔ ان کلمات کے ذریعے سے بندہ اپنے رب سے یہ استدعا کرتا ہے کہ وہ اس کام میں اس کو برکت عطا فرمائیں اور اس کی غلطیوں سے درگذر فرمائیں۔

باقی تمام کاموں کی طرح وضو سے پہلے بھی یقیناً ہم کو 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنی چاہیے۔ اس بات کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید سے دی

ہے۔

۲۔ وضو سے پہلے ہاتھ دھونا

وضو کرنے سے پہلے ہاتھوں کو اچھی طرح سے دھو لینا عقل وفطرت کا تقاضا ہے۔ ہاتھوں ہی سے وضو کے باقی تمام اعضا دھوئے جاتے ہیں، اس وجہ سے ان کو دھونے سے پہلے ہاتھوں کی صفائی کے بارے میں وضو کرنے والے کو تسلی کر لینی چاہیے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے عقل وفطرت کے اسی تقاضے کی وجہ سے یہ فرمایا کہ:

إذا استيقظ أحدكم من نومه فليغسل يده قبل أن يدخلها في وضوئه فإن أحدكم لا يدري أين باتت يده. (بخاری، رقم ۱۵۷)

''جب تم میں سے کوئی نیند سے بیدار ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ وضو کے برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے ان کو دھو لے، کیونکہ وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کا ہاتھ رات بھر کہاں رہا۔''

اس روایت میں ہاتھوں کو دھونے کی وجہ وضو کرنے والے کا نیند سے بیدار ہونا ہی نہیں، بلکہ اس کے ہاتھوں کی صفائی کا غیر یقینی ہونا بھی ہے۔ لہٰذا اس بات کو صرف نیند سے بیدار ہونے والے کے ساتھ خاص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

۳۔ کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا

ایک سلیم الفطرت انسان جس وقت اپنے چہرے کو پورے اہتمام کے ساتھ دھوتا ہے تو یقیناً وہ اپنے دانت صاف کرتا یا کم از کم اچھی طرح سے کلی کر لیتا ہے اور اپنی

ناک اچھی طرح سے صاف کر لیتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی اسی بات کی تعلیم ملتی ہے۔ آپ جب وضو کرتے تو ہاتھ دھو کر سب سے پہلے کلی کرتے اور پھر ناک میں پانی ڈال کر اسے اچھی طرح سے جھاڑ لیتے تھے۔

۴۔ اعضاے وضو کو اچھی طرح دھونا

یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ وضو کے تمام اعضا کو بہت اچھے طریقے سے دھونا بھی اس اہتمام کا لازمی تقاضا ہے جس اہتمام کا وضو کا یہ حکم متقاضی ہے۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہی رہا کہ آپ اعضاے وضو کو تین تین بار مل کر دھوتے۔ اس کے علاوہ آپ نے وضو کے اعضا کو اچھی طرح دھونے کی تاکید فرمائی ہے، اس ضمن میں جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

أخبرني عمر بن الخطاب أن رجلاً توضأ فترك موضع ظفر على قدمه فأبصره النبي صلى الله عليه وسلم فقال: ارجع فأحسن وضوءك. (مسلم، رقم ۳۵۹)

''مجھے حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے بتایا کہ ایک شخص نے وضو کیا اور ایک ناخن کے برابر پاؤں سوکھا چھوڑ دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ جاؤ اور اچھی طرح سے وضو کر کے آؤ۔''

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، جس میں پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو جلدی جلدی اور بے احتیاطی کے ساتھ وضو کرتے دیکھا تو فرمایا:

ویل للأعقاب من النار أسبغوا الوضوء. (مسلم، رقم ۲۴۱) ''بربادی ہے ایڑیوں کی، جہنم کی آگ سے، اچھی طرح سے اور پورا پورا وضو کیا کرو۔''

۵۔ وضو میں داہنے عضو کو پہلے دھونا

کاموں کو دائیں ہاتھ سے کرنے کے بارے میں بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم كان يحب التيمن فى الطهور إذا تطهر وفى ترجله إذا ترجل وفى انتعاله إذا انتعل. (ابن ماجہ، رقم ۳۹۵) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داہنی طرف سے وضو شروع کرنا پسند فرماتے جب بھی وضو کرتے اور اسی طرح کنگھی کرنے میں جب بھی کنگھی کرتے اور جوتا پہننے میں جب بھی جوتا پہنتے۔''

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: إذا توضأ تم فابدء وا بميامنكم. (ابن ماجہ، رقم ۳۹۶) ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم وضو کرو تو پہلے داہنے اعضا دھویا کرو۔''

کام کرنے سے پہلے 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنے یا کاموں کو دائیں ہاتھ سے شروع کرنے کا تعلق اسلامی معاشرت کی تہذیبی روایات سے ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ہم کو اللہ کا دین پہنچایا، اسی طرح ایک صالح معاشرہ بنانے کے لیے تہذیبی روایات دیں اور اس کے آداب واطوار بھی سکھائے۔

خلاصۂ بحث

اوپر کی ساری بحث کو پیش نظر رکھتے ہوئے وضو کی جو بہترین اور کامل ترین صورت سامنے آتی ہے، اس کے اجزا کو بالترتیب ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں:

۱۔ وضو کرنے سے پہلے 'بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ' پڑھنا۔

۲۔ ہاتھوں کو کلائیوں تک اچھی طرح سے دھو لینا۔ پہلے دایاں ہاتھ دھونا اور پھر بایاں۔

۳۔ مسواک، برش یا انگلی کے ساتھ دانت صاف کرنا یا کم از کم اچھی طرح سے کلی کرنا۔

۴۔ ناک میں پانی ڈال کر اسے اچھی طرح سے جھاڑنا۔

۵۔ بہت اچھی طرح سے چہرہ دھونا۔ چہرے کو اچھی طرح دھونے کے لیے اسے تین مرتبہ دھو لینا چاہیے۔

۶۔ ہاتھوں کو کہنیوں تک تین مرتبہ مل مل کر دھونا۔ پہلے دایاں بازو اور اس کے بعد بایاں۔

۷۔ دونوں ہاتھوں کو بھگو کر، پیشانی کے بالوں سے لے کر گردن کے بالوں تک، پورے سر کا مسح کرنا۔

۸۔ دونوں پیروں کو اچھی طرح سے مل مل کر دھونا۔ پہلے دایاں پاؤں اور اس کے بعد بایاں۔

یہی وہ بہترین اور مبارک طریقہ ہے جس کو ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا اور جس کی آپ نے تعلیم دی، اس وجہ سے ہم کو عام حالات میں اسی طریقے پر وضو کرنا چاہیے اور اسی طریقے کی لوگوں کو تعلیم دینی چاہیے، لیکن، جیسا کہ ہم یہ بات پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے کوئی شخص اس طریقے کو ملحوظ نہیں رکھتا اور وہی چار اعضا ایک ایک مرتبہ، اسی ترتیب کے ساتھ جو قرآن مجید میں مذکور ہے بغیر کسی وقفے کے دھو لیتا ہے اور اسی وضو سے نماز ادا کر لیتا ہے تو اس نے وضو کا حکم پورا کر دیا۔ اس کو نماز اور وضو کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

فصل ۲: تنبیہات

۱۔ وضو کا ثواب

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی متعدد احادیث مروی ہیں جن میں آپ نے اچھی طرح سے وضو کرنے کا بہت اجر و ثواب بیان فرمایا ہے۔ آپ کے فرمان کے مطابق قیامت کے روز مسلمانوں کی تکریم اور عزت افزائی کے لیے ان کے چہرے اور ہاتھ

پاؤں وضو کرنے کی وجہ سے روشن کیے جائیں گے اور جو شخص جتنا اچھا وضو کرے گا، اس کے یہ اعضا اتنے ہی زیادہ روشن ہوں گے۔[۲]

اہل ایمان کے چہروں کے روشن اور تابناک ہونے کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے۔

ارشاد ہے:

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ، ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ. (عبس ۸۰: ۳۸-۳۹) ''کتنے چہرے اس دن روشن ہوں گے، ہنستے ہوئے، ہشاش بشاش۔''

ایک اور روایت میں ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص اچھی طرح وضو کرے گا اور پھر پورے خضوع وخشوع کے ساتھ نماز ادا کرے گا تو یہ اس کے پچھلے صغیرہ گناہوں کے لیے کفارہ بن جائے گا۔[۳]

۲۔ ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا

قرآن مجید میں سورۂ مائدہ کی جس آیت میں وضو، غسل اور تیمّم کا حکم آیا ہے، وہ آیت ان الفاظ پر ختم ہوئی ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ ''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا

---

۲ بخاری، رقم ۱۳۳۔

۳ مسلم، رقم ۳۳۱-۳۳۲، ۳۳۶۔

وَلِيُتِمَّ نِعۡمَتَهٗ عَلَيۡكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ. (المائدہ ۵:۶)	ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

اس سے یہ بات بڑی واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ وضو، غسل یا تیمّم کا مقصد اصلاً پاکیزگی حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس پاکیزگی کی حالت میں ہے جو شریعت نے اس پر لازم کی ہے تو اس کو وضو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس لیے ہر نماز کے لیے نیا وضو کرنا ضروری نہیں ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے۔ روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ہر نماز کے لیے تازہ وضو کیا کرتے تھے۔ اس باب میں ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی ''سنن'' کی ''کتاب الطہارۃ'' میں ایک روایت نقل کی ہے، وہ ہم یہاں درج کیے دیتے ہیں:

عن أبی غطیف الهذلی قال: سمعت عبد اللّٰه بن عمر بن الخطاب فی مجلسه فی المسجد فلما حضرت الصلٰوة قام فتوضأ و صلی ثم عاد إلی مجلسه فلما حضرت	''ابوغطیف ہذلی کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمر بن خطاب کو سنا، جبکہ وہ مسجد نبوی میں اپنی مجلس میں بیٹھے تھے۔ جب نماز کا وقت ہوا تو وہ اٹھے، پھر انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور دوبارہ اپنی نشست پر آ بیٹھے، پھر عصر کا وقت

العصر قام فتوضأ وصلى ثم عاد إلى مجلسه فلما حضرت المغرب قام فتوضأ وصلى ثم عاد إلى مجلسه فقلت: أصلحك اللّٰه أفريضة أم سنة الوضوء عند كل صلوٰة؟ قال: أو فطنت إلى وإلى هٰذا منى؟ فقلت: نعم فقال: لا، لو توضأت لـصلوٰة الصبح لصليت به الصلوٰت كلها مالم أحدث ولكنى سمعت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم يقول: من توضأ على كل طهر فله عشر حسنات وإنما رغبت فى الحسنات. (رقم ۵۰۵)

ہوا، اٹھے، انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی اور پھر آ بیٹھے، پھر جب مغرب کا وقت ہوا تو اٹھے، انھوں نے وضو کیا، نماز پڑھی، پھر واپس آ بیٹھے تو میں نے ان سے عرض کیا کہ اللہ آپ کو خوش رکھے، ہر نماز سے پہلے وضو کرنا فرض ہے یا سنت؟ تو انھوں نے پوچھا کہ کیا تم نے میرے عمل سے یہ بات سمجھی؟ میں نے کہا: جی ہاں، انھوں نے کہا: یہ نہ فرض ہے اور نہ سنت۔ اگر میں نے صبح کی نماز کے لیے وضو کیا ہو تو میں اس سے ساری نمازیں ادا کر سکتا ہوں، جب تک میرا وضو ٹوٹ نہ جائے، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص وضو کے ہوتے ہوئے وضو کرے گا تو اس کے لیے دس نیکیاں ہیں۔ اور میں تو نیکیوں ہی کا خواہش مند ہوں۔''

اس سے بھی یہی بات واضح ہوئی کہ تجدید وضو نہ فرض ہے اور نہ سنت۔ اتنی ہی بات کہنی چاہیے جتنی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمائی ہے، یعنی یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کا بہت اجر بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ اس اجر کے حصول کے لیے ایسا کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ وضو کی دعائیں

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں مختلف مواقع کے لیے نہایت پاکیزہ اور جامع دعائیں سکھائی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ ان میں سے زیادہ سے زیادہ دعائیں یاد کر کے ان کو موقع کے لحاظ سے پڑھے اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دے۔

۱۔ وضو کے بعد یہ دعا کرنی چاہیے:

أشهد أن لا إله إلا اللّٰه وحده، لا شريك له، وأشهد أن محمدًا عبده، ورسوله، أللّٰهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين. (ترمذی، رقم ۵۰)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ اے اللہ، مجھ کو بہت توبہ کرنے والوں اور بہت پاکیزگی حاصل کرنے والوں میں سے بنا۔''

۲۔امام مسلم نے اسے اس طرح نقل کیا ہے کہ اس میں سے دعا کا کچھ حصہ حذف ہوگیا ہے:

أشهد أن لا إله إلا الله و أن محمدًا عبد الله، و رسوله. (مسلم، رقم ۳۴۵)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔''

ہمارے نزدیک امام ترمذی کی روایت میں مکمل دعا نقل ہوئی ہے اور ہمیں اسی کا التزام رکھنا چاہیے۔

فصل ۳: رخصتیں

۱۔ پاؤں دھونے میں رخصت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی سہولت کے لیے یہ رخصت عطا فرمائی کہ اگر کوئی شخص وضو کرتا ہے اور وضو ہی کی حالت میں موزے یا جرابیں پہن لیتا ہے تو اس حال میں وہ اگلا وضو کرتے وقت اپنی جرابوں پر مسح کر سکتا ہے:

عن عروة بن المغيرة عن أبيه قال: كنت مع النبي صلى الله عليه و سلم في سفر فأهويت

''عروہ بن مغیرہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں نبی صلی اللہ علیہ

لأنزع خفيه فقال: دعهما فإني ادخلتهما طاهرتين فمسح عليهما. (بخاری، رقم ۱۹۹)

وسلم کے ساتھ تھا۔ (جب آپ نے وضو کیا) تو میں نے چاہا کہ میں آپ کے موزے اتاروں (تاکہ آپ پاؤں دھولیں) تو آپ نے فرمایا کہ ان کو رہنے دو، میں نے وضو کی حالت میں موزے پہنے تھے، پھر آپ نے ان پر مسح کرلیا۔''

موطا امام مالک میں اس رخصت سے متعلق ایک مفصل روایت نقل ہوئی ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ایک مرتبہ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے موزوں پر مسح کرتے دیکھا تو ان کو یہ بات کچھ اجنبی معلوم ہوئی۔ چنانچہ انھوں نے سعد رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ جب آپ کے والد صاحب یہاں آئیں تو ان سے پوچھیے گا۔ جب یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا گیا تو جواب میں انھوں نے فرمایا:

إذا أدخلت رجليك في الخفين وهما طاهرتان فامسح عليهما قال عبد اللّٰه: وإن جاء أحدنا من الغائط؟ فقال عمر: نعم وإن

''اگر تم وضو کی حالت میں موزے پہنو تو تم ان پر مسح کر سکتے ہو۔ عبداللہ بن عمر نے دریافت کیا کہ اگر ہم نے رفع حاجت کی ہو تو کیا تب بھی ہم مسح

جاء أحدكم من الغائط. (رقم ٦٥)

کر سکتے ہیں؟ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ ہاں، اگر تم نے رفع حاجت کی ہو تب بھی تم ایسا کر سکتے ہو۔''

اس باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو روایات آئی ہیں، ان میں موزوں اور جرابوں، دونوں کے لیے یہ رخصت ثابت ہوتی ہے۔ سعد بن ابی وقاص، مغیرہ بن شعبہ اور عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ عنہم سے روایات ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا۔ ہم یہاں پر اختصار کے پیش نظر صرف ایک روایت نقل کیے دیتے ہیں:

عن عروة بن المغيرة عن أبيه المغيرة بن شعبة عن رسول الله صلى الله عليه و سلم أنه خرج لحاجته فاتبعه المغيرة بإداوة فيها ماء فصب عليه حين فرغ من حاجته فتوضأ و مسح على الخفين. (بخاری، رقم ١٩٦)

''حضرت عروہ بن مغیرہ اپنے والد گرامی مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے لیے نکلے تو مغیرہ پانی کا ایک ڈول لے کر آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جب آپ فارغ ہوئے تو مغیرہ نے آپ کے لیے پانی ڈالا، آپ نے وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا۔''

اسی طرح سنن ابن ماجہ میں ایک روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جرابوں پر بھی مسح کیا:

عن المغيرة بن شعبة أن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم توضأ ومسح على الجوربين والنعلين. (رقم ۵۵۲)	''مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''

یہ بات بظاہر قرآن مجید کے حکم کے خلاف معلوم ہوتی ہے، یعنی یہ کہ قرآن مجید میں تو وضو کرتے وقت پاؤں دھونے کا حکم ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی ہے کہ پیروں کو دھونے کے بجاے ان پر مسح بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس مسئلے کا قطعی حل ہمارے استاذ جاوید احمد صاحب غامدی نے بیان فرمایا ہے، ہم ان کی تحقیق کا ضروری حصہ یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس ارشاد[۴] خداوندی سے صاف واضح ہے کہ یہ طہارت جب تک باقی رہے گی، اس وقت تک تازہ وضو کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اسے اگر ایک مرتبہ حاصل

۴؎ 'مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ'، ''اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتے کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کریں، بلکہ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تمھیں پاک کریں اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دیں تاکہ تم ان کے شکر گزار ہو۔'' (المائدہ ۵: ۶)

کرلیا جائے تو یہ کب تک باقی رہتی ہے؟ اس سوال کا مفصل جواب ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ملتا ہے۔ آپ نے بتایا ہے کہ جب تک پاخانے کی راہ سے ہوا خارج نہ ہو یا آدمی رفع حاجت کے لیے نہ جائے یا بیوی کے قریب نہ ہو، یا سو نہ جائے، اس وقت تک یہ طہارت لازماً قائم رہتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی آپ نے بتائی ہے کہ وضو کے بعد اگر جراب پہن لی جائے تو پیروں کی طہارت ان نواقض کے پیش آجانے سے بھی ختم نہیں ہوتی۔ اس صورت میں یہی کافی ہے کہ اس کی علامت کے طور پر ان کا مسح کرلیا جائے۔ یہ سب، بالبداہت واضح ہے کہ اس علت کا بیان ہے، جس پر وضو کا یہ حکم خود قرآن مجید کی رو سے مبنی ہے۔ اس سے قرآن کے مدعا میں کسی نوعیت کا کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔''

(ماہنامہ اشراق، مئی ۱۹۹۰ء، ۶۵-۶۶)

اس رخصت کی مدت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ مسافر کے لیے تین روز تک اور مقیم کے لیے ایک روز پیروں پر مسح کرنے کی اجازت ہے:

عن شريح بن هانئ قال: أتيت	''شریح بن ہانی کہتے ہیں کہ میں
عـائشة أسئلها عن المسح	حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے
على الخفين فقالت: عليك	پاس گیا اور ان سے پیروں پر مسح
بإبن أبي طالب فاسئله فإنه	(کی مدت) کے بارے میں پوچھا تو
كـان يسافر مـع رسول الله	انھوں نے فرمایا کہ اس بارے میں تم

صلى الله عليه وسلم فسئلناه فقال: جعل رسول الله صلى الله عليه وسلم ثلاثة أيام ولياليهن للمسافر ويومًا وليلة للمقيم. (مسلم، رقم ۴۱۴)

حضرت علی سے پوچھ لو، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ہم نے حضرت علی سے پوچھا تو انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسافر کے لیے تین دن اور تین راتوں تک اور مقیم کے لیے ایک دن اور رات تک پیروں پر مسح کرنے کی اجازت دی ہے۔''

۲۔ سر پر مسح کرنے میں رخصت

جرابوں پر مسح کی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رخصت بھی دی ہے کہ اگر کسی شخص نے وضو کی حالت میں عمامہ یا پگڑی باندھ رکھی ہے تو وہ اس کو اتارے بغیر اسی کے اوپر مسح کر سکتا ہے:

عن ابن المغيرة عن أبيه أن النبى صلى الله عليه وسلم مسح على الخفين ومقدم راسه وعلى عمامته. (مسلم، رقم ۴۱۱)

''حضرت ابن مغیرہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (وضو میں) موزوں پر مسح کیا اور اپنے سر کے اگلے حصے پر اور اپنے عمامے پر مسح کیا۔''

ہمارے نزدیک اس کی تفصیل بھی وہی ہے جو پیروں کے مسح کی اجازت میں ہم نے اوپر بیان کی ہے۔

فصل ۴: نواقض وضو

یہ بات پہلے بھی بیان کی جا چکی ہے کہ وضو کے ہوتے ہوئے ہر نماز کے لیے تازہ وضو کرنا ضروری نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن کے واقع ہونے کے بعد تازہ وضو کرنا ضروری ہے؟ انھی چیزوں کو 'نواقض وضو' کہا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن همام بن منبه أنه سمع أبا هريرة يقول: قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم: لا تقبل صلٰوة من أحدث حتى يتوضأ. (بخاری، رقم ۱۳۲)

''ہمام بن منبہ سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت ابوہریرہ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو 'حدث' لاحق ہو جائے، اس کی نماز اس وقت تک قبول نہیں ہوتی، جب تک وہ وضو نہ کر لے۔''

اس 'حدث' کی وہ تفصیل جو ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ سے ملتی ہے، اس کے مطابق یہ چیزیں وضو کی نواقض ہیں:

۱۔ ریح کا اخراج،

۲۔ پیشاب کرنا،

۳۔ پاخانہ کرنا،

۴۔ مذی* کا اخراج،

۵۔ منی کا اخراج،

۶۔ جماع کرنا۔

ان میں سے آخری دو کے واقع ہونے سے وضو تو ٹوٹ جائے گا، مگر طہارت حاصل کرنے کے لیے اب صرف وضو کافی نہ ہوگا، بلکہ غسل کرنا بھی ضروری ہوگا۔

مذی کے خارج ہونے اور پیشاب اور پاخانہ کرنے کی صورت میں اپنی شرم گاہ کو دھو لینا چاہیے اور اگر پانی نہ ہو یا اس کی قلت ہو تو اپنی شرم گاہ کو خشک ڈھیلوں سے صاف کر لینا چاہیے۔ اس زمانے میں پانی نہ ہونے کی صورت میں ٹشو پیپر (Tissue Paper) بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اگر سبیلین (یعنی انسانی جسم سے نجاست کے اخراج کے دونوں راستوں) سے کسی اور چیز کا اخراج ہو، مثلاً اگر پیشاب کے راستے سے پتھری نکلے تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی چیزوں کے ساتھ عام طور سے نجاست بھی لگی ہوتی ہے۔

---

* مذی سے مراد وہ سیال مادہ ہے جو شہوت کے وقت شرم گاہ سے خارج ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں وضو کے نواقض صرف ضمنی طور پر زیر بحث آئے ہیں۔ سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ	''اے ایمان والو، جب تم نماز کی
اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ	تیاری کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا	اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوو اور اپنے
بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى	سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں
الْكَعْبَيْنِ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا	تک دھوو۔ اور اگر تم حالت جنابت
فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى	میں ہو تو غسل کرلو، اور اگر تم مریض
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ	ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی
مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ	جائے ضرور سے آیا ہو یا تم نے عورتوں
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا	سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ	پاک جگہ دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے
وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ	ہاتھوں پر اس سے مسح کرلو، اللہ یہ نہیں
لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ	چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا
يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ	کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں
عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ.	پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام
	کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔''

اس آیت سے بالترتیب یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ یہ کہ عام حالات میں، اگر آدمی کا وضو نہیں ہے تو اسے نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

۲۔ یہ کہ آدمی اگر جنابت کی حالت میں ہے تو نماز کے لیے اسے وضو نہیں، بلکہ اچھی طرح غسل کرنا ہوگا۔

۳۔ یہ کہ سفر، مرض یا پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم* کر سکتا ہے، خواہ اسے طہارت حاصل کرنے کے لیے وضو کی ضرورت ہو یا غسل کی (یعنی یہ کہ خواہ اس نے رفع حاجت کی ہو یا جماع)۔

۴۔ یہ کہ وضو، غسل اور تیمّم کے حکم سے منشائے خداوندی ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے لیے کسی قسم کی تنگی پیدا کی جائے، بلکہ اس سے انھی کو پاکیزہ بنانا مقصود ہے۔

اس آیت کے پہلے حصے 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا ... فَاطَّهَّرُوْا' سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وضو ٹوٹنے کی دو صورتیں ہیں: ایک وہ جس کے بعد دوبارہ طہارت حاصل کرنے کے لیے وضو کرنا ضروری ہے اور دوسری وہ جس کے بعد وضو کافی نہیں، بلکہ غسل کرنا ہوگا۔ آیت کے آخری حصے 'وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى ... لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں انھی دونوں صورتوں کی بڑی بڑی مثالیں دے کر یہ بتا دیا گیا ہے کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں، دونوں ہی حالتوں میں تیمّم کیا جا سکتا ہے۔

---

* تیمّم: پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت حاصل کرنے کا طریقہ۔ تیمّم پر مفصل بحث ''باب التیمم'' میں آئے گی۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' والا حصہ نواقض وضو کا بیان نہیں ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تیمّم کون کون سی صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں پر اگر 'اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' کا حصہ نہ ہوتا تو اس صورت میں یہ مسئلہ لازماً پیدا ہوتا کہ اگر آدمی جنبی ہے تو اسے غسل ہی کرنا پڑے گا اور پانی نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ تیمّم نہیں کر سکتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ذریعے سے نواقض وضو کی انھی دو صورتوں کی تفصیل امت کو منتقل کی۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، پاخانہ، پیشاب اور ریح کا اخراج پہلی صورت کی تفصیل اور اس کے لواحق کی حیثیت رکھتے ہیں، جبکہ جماع، منی اور مذی کا اخراج دوسری صورت کی تفصیل اور اس کے لواحق ہیں۔

خبر آحاد* سے نواقض وضو کی تفصیل

خبر آحاد سے نواقض وضو کے بارے میں جو تفصیل ملتی ہے، وہ ہم یہاں ایک ترتیب کے ساتھ درج کیے دیتے ہیں:

۱۔ نیند

سونے سے چونکہ وضو کے ٹوٹنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ بات عقل و

* خبر واحد سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر و تصویب کی وہ روایت ہے جسے راویوں کی اتنی تعداد نے بیان نہ کیا ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ اس میں کسی شک کی گنجایش باقی نہیں رہی۔

فطرت کے عین مطابق ہے کہ آدمی سو کر اٹھنے کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے وضو کرلے۔ یہی بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمائی۔ آپ کا ارشاد ہے:

عن علی بن أبی طالب رضی اللّٰہ عنه قال: قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم: وکاء السه العینان فمن نام فلیتوضأ. (ابوداؤد، رقم ۴۷۰)

''حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (جاگتی) آنکھیں دبر (سے خارج ہونے والی ریح) پر محافظ ہیں۔ چنانچہ جو سو گیا، اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرلے۔''

اس روایت سے یہ بات پوری طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کا سونا یا اس پر نیند کا غلبہ پالینا بذات خود ناقض وضو نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ سے وضو ٹوٹنے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کو نیند سے بیدار ہونے کے بعد، نماز ادا کرنے سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ آدمی اگر ایسی نیند سویا ہے کہ اس کو اپنی طہارت کے بارے میں پورا یقین ہے (مثال کے طور پر بیٹھے بیٹھے اونگھ جانا) تو اس کو دوبارہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح کی بات اس روایت میں بھی بیان ہوئی ہے:

عن أنس بن مالك قال: کان

''انس بن مالک روایت کرتے ہیں

أصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ینامون ثم یقومون فیصلون ولا یتوضئون.

کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوجایا کرتے، پھر اٹھتے اور وضو کیے بغیر نماز ادا کر لیتے۔''

(ترمذی، رقم ۷۳)

اسی طرح روایات میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہو کر وضو کیے بغیر نماز ادا کر لیتے۔ اس بات کا جواب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دیا:

قالت عائشة رضی اللّٰہ عنہا: قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم: تنام عیناي ولا ینام قلبی. (ابوداؤد، رقم ۱۷۴)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔''

۲۔ شک میں رخصت

نماز کے دوران میں اگر کسی شخص کو یہ شک ہو جائے کہ وہ وضو سے ہے یا نہیں تو اسے اس وقت تک تازہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں، جب تک کہ اسے اس بات کا یقین نہ ہو جائے کہ وہ وضو سے نہیں ہے۔

اس باب میں امام مسلم اپنی ''صحیح'' کی ''کتاب الطہارۃ'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت لائے ہیں کہ:

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: إذا وجد أحدکم فی بطنہ شیئًا فأشکل علیہ أخرج منہ شیٔ أم لا فلا یخرجن من المسجد حتی یسمع صوتًا أو یجد ریحًا. (مسلم، رقم ۵۴۱)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنے پیٹ میں کوئی چیز (یعنی ریح) محسوس کرے اور اس کو یہ یقین نہ ہو کہ وہ خارج ہوئی ہے یا نہیں تو وہ مسجد سے (وضو کرنے کے لیے) نہ نکلے، جب تک وہ آواز نہ سن لے یا بدبو نہ محسوس کر لے (یعنی اس کو ہوا خارج ہونے کا یقین نہ ہو جائے)۔''

۳۔ بیماری میں رخصت

اگر کسی شخص کو ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے سبیلین سے کوئی چیز خارج ہوتی رہتی ہو تو اس صورت میں اس کو ہر نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر نماز کے دوران میں اس کو یہ چیز خارج ہوتی محسوس ہو تو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رخصت کی اساس قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے خود قرآن ہی کی رو سے ایک استثنا کے ساتھ مشروط ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ۲:۲۳۳)

''کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلّف نہیں ٹھہرایا جاتا۔''

اسی طرح وضو، غسل اور تیمّم کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

اس قسم کی بیماری میں یہ رخصت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری نے یہ روایت نقل کی ہے:

هشام بن عروة عن أبيه عن عائشة قالت: جاء ت فاطمة بنت أبى حبيش إلى النبى صلى اللّٰه عليه و سلم فقالت: يارسول اللّٰه إنى إمرأة أستحاض فلا أطهر أفأد ع الصلٰوة؟ فقال

''ہشام بن عروہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ، مجھے استحاضہ ہے۔ چنانچہ میں کبھی پاک

رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا إنما ذلك عرق وليس بحيض فإذا أقبلت حيضتك فدعي الصلوة وإذا أدبرت فاغسلي عنك الدم ثم صلي قال: وقال أبي: ثم توضئي لكل صلوة حتى يجئ ذلك الوقت. (بخاری، رقم ۲۲۱)	نہیں ہوتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، نماز مت چھوڑو، یہ تو صرف ایک رگ (کا خون) ہے، یہ حیض نہیں ہے۔ جب تمھیں حیض شروع ہو تو نماز چھوڑ دو اور جب ختم ہو جائے تو خون دھولو اور پھر نماز پڑھو۔ (ہشام اپنے والد عروہ کے حوالے سے) کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: پھر ہر نماز کے لیے وضو کر لیا کرو، یہاں تک کہ پھر حیض کے ایام آ جائیں۔''

۴۔نواقض ــــ چند اختلافات

روایات سے جن مزید نواقض کا علم ہوتا ہے، ان میں امت کا اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر خون کے بہنے سے، قے یا نکسیر سے، آگ پر پکے ہوئے کھانے اور اونٹ کا گوشت کھانے سے، عورت کو چھونے سے، شرم گاہ چھونے سے یا نماز کے دوران میں قہقہہ لگانے سے وضو کا ٹوٹنا وغیرہ۔ ان تمام معاملات میں دونوں قسم کی روایات موجود ہیں: ایک وہ جن سے یہ چیزیں وضو کی ناقض معلوم ہوتی ہیں۔ اور دوسری وہ جن سے

اس کے برعکس بات معلوم ہوتی ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات میں ترجیح کے لیے ہمارے نزدیک اگرچہ یہی بات کافی ہے کہ قرآن مجید نے اس باب میں جو دو اصول (اگرچہ ضمنی طور پر ہی سہی) 'اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ' اور 'لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ' کی صورت میں بیان کر دیے ہیں، ان سے متجاوز کوئی روایت کسی حال میں قبول نہیں کی جا سکتی۔ تاہم ان روایات کی حیثیت بھی ہم یہاں واضح کیے دیتے ہیں۔

نماز کے دوران میں قہقہے سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں مولانا ظفر احمد عثمانی نے اپنی کتاب ''اعلاء السنن'' میں بہت سی روایات نقل کر دی ہیں۔ ان میں سے ایک روایت ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں:

عن أبي موسىٰ رضي اللّٰه	''ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ
عنه قال: بينما رسول اللّٰه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ
صلى اللّٰه عليه وسلم يصلي	رہے تھے کہ ایک آدمی آیا، جس کی
إذا دخل رجل فتردى في	آنکھوں میں نقص تھا اور ایک گڑھے
حفرة كانت في المسجد،	میں گر گیا جو مسجد میں تھا۔ اس پر بہت
وكان ببصره ضرر، فضحك	سے لوگ نماز کے دوران میں ہنس
كثير من القوم وهم في	پڑے۔ جو لوگ ہنسے تھے، ان کو
الصلاة، فأمر رسول اللّٰه	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم
صلى اللّٰه عليه وسلم من	دیا کہ وہ دوبارہ وضو کر کے آئیں اور

ضحك أن يعيد الوضوء ويعيد الصلوٰة رواه الطبراني في الكبير. (کتاب الطہارۃ: باب نقض الوضو من القہقہۃ فی الصلوٰۃ)

اپنی نماز دہرائیں۔ یہ طبرانی نے ''المعجم الکبیر'' میں روایت کیا ہے۔''

جن روایات سے نماز کے دوران میں قہقہہ مارنے سے وضو کا ٹوٹنا ثابت ہوتا ہے، ان کے بارے میں ابن قدامہ ''المغنی'' میں لکھتے ہیں:

وروى من غير طريق أبي العالية بأسانيد ضعاف. وحاصله يرجع إلى أبي العالية ... ومارووه مرسل لا يثبت وقد قال ابن سيرين: لا تاخذوا بمراسيل الحسن وأبي العالية فإنهما لا يباليان عمن أخذا. (۱۱۶/۱)

''ابوالعالیہ کے (طریقہ کے) علاوہ یہ روایت سند کے ضعف کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ ابوالعالیہ ہی کی سند کے ساتھ ہے... اور جو وہ روایت کرتے ہیں، وہ مرسل ہے اور ثابت نہیں ہے۔ ابن سیرین نے کہا ہے کہ حسن اور ابوالعالیہ کی مرسل روایتیں مت لو، کیونکہ وہ دونوں حضرات اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے کہ وہ کس سے روایت قبول کر رہے ہیں۔''

ابن حزم ان روایات کے بارے میں فرماتے ہیں:

وأما الضحك فى الصلٰوة فإنا روينا فى إيجاب الوضوء منه أثرا واهيًا لا يصح. لأنه إما مرسل من طريق أبى العالية وإبراهيم النخعى وإبن سيرين والزهرى وعن الحسن عن معبد بن صبيح ومعبد الجهنى وإما مسند من طريق أنس وأبى موسٰى وأبى هريرة وعمران بن حصين وجابر وأبى المليح، وروينا إيجاب الوضوء منه عن أبى موسٰى الأشعرى وإبراهيم النخعى والشعبى وسفيان الثورى والأوزاعى والحسن بن حى وعبيد اللّٰه بن الحسن وأبى حنيفة وأصحابه. فأما حديث أنس فإنه من طريق أحمد بن

”جہاں تک نماز میں ہنسنے کا تعلق ہے تو ہم نے اس سے وضو کے واجب ہونے میں چند کمزور روایات نقل کر دی ہیں جو صحیح نہیں ہیں، اس لیے کہ یا تو وہ ابوالعالیہ، ابراہیم نخعی، ابن سیرین، زہری، حسن، معبد بن صبیح، معبد الجہنی سے مرسل ہیں اور یا انس، ابوموسیٰ، ابوہریرہ، عمران بن حصین، جابر، اور ابوالملیح سے مسند ہیں۔ ان (مسند روایات) میں سے ہم نے جن میں وضو کا واجب ہونا نقل کیا ہے، وہ ابوموسیٰ اشعری، ابراہیم نخعی، شعبی، سفیان ثوری، اوزاعی، حسن بن حی، عبیداللہ بن حسن، ابوحنیفہ اور ان کے ساتھیوں سے ہیں۔ انس کی روایت جو کہ احمد بن عبداللہ بن زیادتستری اور عبدالرحمٰن بن عمر کے طریق سے مروی ہے، اس میں ابوحیلہ ہیں جو مجہول ہیں۔

عبد اللّٰه بن زياد التترى عن عبد الرحمن بن عمر وأبى حيلة وهو مجهول، وأما حديث أبى موسٰى ففيه محمد بن نعيم وهو مجهول، وأما حديث أبى هريرة ففيه عبد الكريم بن أبى المخارق وهو غير ثقة وأما حديث عمران بن حصين ففيه إسماعيل بن عياش وعبد الوهاب بن نجدة وهما ضعيفان، وأما حديث جابر ففيه أبو سفيان وهو ضعيف وأما حديث أبى المليح ففيه الحسن بن دينار وهو مذكور بالكذب.

(المحلّٰی ۱/۲۶۴-۲۶۵)

ابوموسیٰ کی روایت میں محمد بن نعیم ہیں جو مجہول ہیں۔ابوہریرہ کی روایت میں عبدالکریم بن ابی المخارق ہیں جو غیر ثقہ ہیں۔عمران بن حصین کی روایت میں اسماعیل بن عیاش اور عبدالوہاب بن نجدہ ہیں اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔جابر کی روایت میں ابوسفیان ہیں جو ضعیف ہیں۔ابوالملیح کی روایت میں حسن بن دینار ہیں جن کو جھوٹا کہا گیا ہے۔''

''المغنی'' اور ''المحلّٰی'' کے ان اقتباسات کی روشنی میں ہم قہقہہ سے وضو ٹوٹنے کی مذکورہ روایات کو اس بات کے لیے ناکافی سمجھتے ہیں کہ ان کی بنیاد پر قہقہہ کو ناقض وضو

قرار دیا جائے۔

نکسیر پھوٹنے، قے ہونے، کھانا کھانے، جسم سے خون کے بہنے یا اس طرح کی دوسری چیزوں سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں جو روایات حدیث اور فقہ کی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، ان میں فعل 'توضأ' سے مراد کلی کر لینا یا ہاتھ منہ دھو لینا ہے۔

عربی زبان میں ایک فعل، جیسے ارادۂ فعل یا انتہائے فعل کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، ویسے ہی مکمل فعل کے کسی جز پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ یہی بات ابن اثیر نے بھی کہی ہے، وہ کہتے ہیں:

وقد يراد به غسل بعضًا لأعضاء ومنه الحديث: توضئوا مما غيرت النار، أراد به غسل الأيدى والأفواه من الزهومة، ... ومن حديث قتادة: من غسل يده فقد توضأ.
(النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ۸۵۶/۲)

''اس سے مراد کبھی کبھی (پورا وضو کرنے کے بجائے) کچھ اعضا کو دھو لینا ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیزوں سے وضو کر لیا کرو، اس سے مراد ہاتھوں اور منہ سے چکنائی اور بساند کا دھونا ہے، ... اسی طرح قتادہ کہتے ہیں کہ جس نے اپنا ہاتھ دھویا، اس پر فعل 'توضأ' کا اطلاق ہو سکتا ہے۔''

عورت کو چھونے سے وضو کے ساقط ہونے کے بارے میں صحابہ ہی کے زمانے

سے اختلاف رہا ہے۔ عبداللہ بن عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کے نزدیک عورت کو چھونے کے بعد وضو کرنا ضروری ہے، جبکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک ضروری نہیں۔

اس اختلاف کی وجہ قرآن مجید کا ارشاد 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' کے معنی کے تعین کا اختلاف ہے۔ 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' کے لغوی معنی، بلاشبہ عورت کو چھونے ہی کے ہیں، مگر ہمارے نزدیک یہاں پر یہ کنایۃً استعمال ہوا ہے اور اس سے مراد 'جماع' کرنا ہے، نہ کہ محض چھونا۔ عربی زبان میں اس کا یہ استعمال معروف ہے۔ صاحب ''لسان العرب'' 'لمس' کے معنی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: 'اللمس کناية عن الجماع' ('لمس' کو کنایۃً 'جماع' کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے)۔ صاحب ''کشاف'' نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے۔ 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' سے پہلے 'اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ' بھی ایسا ہی اسلوب ہے جس کے معنی رفع حاجت کرنے کے ہیں نہ کہ جائے ضرور سے ہو آنے کے۔

ہمارے نزدیک عورت کو محض چھونے سے وضو ساقط نہیں ہوتا۔ ہماری اس رائے کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی ہوتی ہے جس کو ابوداؤد نے حضرت عائشہ سے ایک روایت میں بیان کیا ہے:

إن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج

قبل إمرأة من نسائه ثم خرج إلى الصلوة ولم يتوضأ.

میں سے کسی کا بوسہ لیتے اور نماز کے لیے جاتے تو وضو نہ کرتے تھے۔''

(ابوداؤد، رقم ۱۵۳)

[۱۹۹۲ء]

باب الغسل

فصل ا: غسل کی فرضیت

قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ کے ارشادات کے مطابق جن موقعوں پر غسل کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

ا۔ جنابت کے بعد نماز پڑھنا

قرآن مجید کے جس مقام پر نماز کے لیے وضو کا حکم آیا ہے، وہیں یہ حکم بھی دے دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص حالت جنابت میں ہے تو اسے وضو نہیں، بلکہ غسل کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا. ''اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کرلو۔'' (المائدہ ۵:۶)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا' کی شرح کرتے ہوئے دو صورتیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔حالت جنابت کی ایک صورت جماع ہے، خواہ اس میں مادۂ تولید (منی) خارج ہو یا نہ ہو۔مسلم نے اپنی ''صحیح'' کی ''کتاب الحیض'' میں یہ روایت نقل کی ہے:

عن أبی موسٰی قال: إختلف	''ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ایک
فی ذلك رهط من المهاجرين	مرتبہ مہاجرین اور انصار کے چند لوگوں
والأنصار فقال الأنصاريون:	میں، اس معاملے میں اختلاف ہو گیا۔
لا يجب الغسل إلا من الدفق	انصار کا خیال تھا کہ غسل انزال ہی
أو من الماء وقال المهاجرون:	سے لازم ہوتا ہے، جبکہ مہاجرین کی
بل إذا خالط فقد وجب	رائے تھی کہ جب مرد، عورت سے صحبت
الغسل قال أبو موسٰی: فأنا	کرے تو غسل واجب ہو جاتا ہے،
أشفيكم من ذلك فقمت	خواہ انزال ہو یا نہ ہو۔ابوموسیٰ کہتے
فاستأذنت على عائشة فأذن	ہیں کہ میں نے کہا: میں تمھاری تسلی
لی فقلت لها: يا أماه أو يا أم	کیے دیتا ہوں، پھر میں حضرت عائشہ
المؤمنين إنی أريد أن أسئلك	کے پاس گیا۔ جب مجھے اندر جانے
عن شئ وإنی أستحييك	کی اجازت ملی تو میں نے عرض کیا:
فقالت: لا تستحيی أن تسألنی	اے ام المومنین، میں آپ سے کچھ
عما كنت سائلًا عنه أمك	پوچھنا چاہتا ہوں، مگر شرم کی وجہ سے

التی ولدتك فإنما أنا أمك قلت: فما یوجب الغسل؟ قالت: علی الخبیر سقطت قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه و سلم: إذا جلس بین شعبها الأربع و مس الختان الختان فقد وجب الغسل. (رقم ۵۲۶)

ہمت نہیں ہورہی۔ انھوں نے فرمایا کہ میں تمھاری سگی ماں کی طرح ہوں، تم جو کچھ پوچھنا چاہو، پوچھ لو۔ میں نے عرض کیا: غسل کرنا کب ضروری ہوتا ہے؟ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مرد عورت سے صحبت کرے اور دونوں کے ختان مل جائیں تو غسل کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔''

ب۔ دوسری صورت جماع کے بغیر شہوت کے ساتھ مادۂ تولید نکلنا ہے۔ مثال کے طور پر احتلام لاحق ہونا۔ ترمذی کی روایت ہے:

عن علی قال: سألت النبی صلی اللّٰہ علیه و سلم عن المذی، فقال: من المذی الوضوء و من المنی الغسل. (رقم ۱۰۶)

''علی (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مذی کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا: مذی کے خارج ہونے کے بعد وضو اور منی نکلنے کے بعد غسل کرنا چاہیے۔''

احتلام کی صورت میں چونکہ یہ شک ہوسکتا ہے کہ واقعی احتلام ہوا ہے یا نہیں۔

لہٰذا اس صورت میں غسل کرنا صرف اس وقت ضروری ہوگا، جب آدمی اپنے کپڑوں یا جسم پر تری یا اس کے آثار محسوس کرے۔ یہی بات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت میں بیان ہوئی ہے:

عن النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: إذا استیقظ أحدکم من نومہ فرای بللاً ولم یرأنہ إحتلم إغتسل وإذا رأی أنہ قد احتلم ولم یر بللاً فلا غسل علیہ. (ابن ماجہ، رقم ۶۰۴)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم بیدار ہونے پر تری دیکھو، مگر تمھیں احتلام یاد نہ ہو، تب بھی غسل کرلو اور تمھارا خیال ہو کہ تمھیں احتلام ہوا ہے، مگر (اپنے جسم یا کپڑوں پر) تم کوئی تری نہ پاؤ تو تمھیں غسل کی کوئی ضرورت نہیں۔''

۲۔ جنبی کا مسجد میں جانا

مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر اور مسلمانوں کی دینی اور سیاسی اجتماع گاہ ہے۔ چنانچہ مسجد کے تقدس کا تقاضا ہے کہ وہاں جاتے وقت ہمیشہ پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام رکھا جائے، اس وجہ سے اگر کوئی مجبوری مانع نہ ہو تو جنابت کی حالت میں مسجد میں نہیں جانا چاہیے۔ اور مجبوری کی صورت میں بھی ایسی حالت میں مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں، صرف گزر جانے کی اجازت ہے۔

سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِىْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا. (۴۳:۴)

''اے ایمان والو، نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ صرف گزر جانا پیش نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کرلو۔''

۳۔ جنبی کا قرآن مجید کو چھونا یا اس کی تلاوت کرنا

جس طرح مسجد کے تقدس کا یہ تقاضا ہے کہ حالت جنابت میں اس میں داخل نہ ہوا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کے تقدس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ایسی حالت میں اسے پڑھا یا چھوا نہ جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یقرأ القرآن الجنب و لا الحائض. (ابن ماجہ، رقم ۵۸۸)

''جنبی اور حائضہ قرآن نہ پڑھیں۔''

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

لا یمس القرآن إلا طاهر. (فقہ السنہ ۱/۴۹)

''قرآن مجید کو صرف وہی چھوئے جو پاک ہو۔''

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ اور، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، قرآن مجید کے اس حکم پر مبنی ہے کہ حالت جنابت میں مسجد میں داخل نہ ہوا جائے۔

چنانچہ جس طرح قرآن مجید نے مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت کے بعد 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' کے الفاظ سے مجبوری کی حالت میں اس ممانعت کو ایک حد تک مستثنیٰ کر دیا ہے، اسی طرح مجبوری کی حالت میں قرآن کو چھونے یا اسے پڑھنے کے معاملے میں بھی ایک حد تک استثنا کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص حالت جنابت میں قرآن مجید کی کوئی دعا پڑھتا یا کوئی مسئلہ بیان کرنے کے لیے اس کی آیات سے استشہاد کرتا ہے تو ہمارے نزدیک یہ بات 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' میں دی گئی رخصت کے تحت جائز ہوگی۔

۴۔ حیض اور نفاس کا خون بند ہونے پر

جنابت کے علاوہ ایک عورت کے لیے اس وقت بھی غسل کرنا ضروری ہے، جب اسے حیض اور نفاس کا خون آنا بند ہو جائے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ. (البقرہ ۲:۲۲۲)

''اور وہ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو: یہ ناپاکی ہے، تو عورتوں سے حیض کے دنوں میں الگ رہو اور ان سے قربت نہ کرو، جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ صفائی کر لیں تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔''

اسی طرح حدیث کی کتابوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال بھی نقل ہوئے ہیں جن میں حیض کے ایام ختم ہونے پر غسل کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

نفاس سے مراد وہ خون ہے جو بچے کی پیدایش کے بعد خارج ہوتا ہے۔ اس کا حکم بھی حیض ہی کی طرح ہے۔ صاحب ''المغنی'' ابن قدامہ لکھتے ہیں:

والنفاس كالحيض سواء فإن	''نفاس بالکل حیض ہی کی طرح ہے،
دم النفاس هو دم الحيض.	کیونکہ نفاس کا خون حیض ہی کا خون
(۱۳۴/۱)	ہوتا ہے۔''

ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلّٰی''[1] میں ایک روایت نقل کی ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کے لیے نفاس ہی کا لفظ استعمال کیا ہے، اس سے انھوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے بارے میں شریعت کا حکم بھی ایک ہی ہے۔

غسل کے چند اور مواقع

ان موقعوں کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ، عیدین اور عرفات کے دن اور کسی غیر مسلم کے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے پر بھی غسل کرنے کی بہت تلقین کی

---

[1] ۲۶/۲۔

ہے۔

۱۔ جمعہ، عیدین اور عرفات کے دن کا غسل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ اور عقل وفطرت کے مسلمات پر مبنی ہے۔ ایک اسلامی معاشرے میں جمعہ اور عیدین کے اجتماعات کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کے لیے عبادت کے اجتماعات ہیں، بلکہ ان کے ذریعے سے عوام اور عمال حکومت کے درمیان ایک براہ راست تعلق قائم ہوتا ہے[۲]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اجتماعات کی اس اہمیت کے پیش نظر ہر مسلمان کے لیے ان میں حاضری کو ضروری ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ ان اجتماعات میں مسلمانوں کے ایک جم غفیر کی شرکت کے پیش نظر آپ نے یہ تعلیم بھی دی کہ ان میں غسل کر کے، صاف ستھرے کپڑے پہن کر اور اگر ممکن ہو تو خوشبو لگا کر حاضر ہونا چاہیے تا کہ پسینے وغیرہ کی بدبو دوسرے حاضرین کے لیے باعث اذیت نہ ہو۔ اسی طرح یوم عرفات کا اجتماع مسلمانوں کے عالم گیر اجتماع کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جس مسلمان کو اس میں شرکت کی سعادت حاصل ہو، اسے بھی غسل کر کے حاضر ہونا چاہیے۔

ابن عبدالبر نے اپنی کتاب ''التمہید'' میں غسل جمعہ کے بارے میں یہ مکالمہ نقل کیا ہے:

عن عكرمة أن ناسًا من أهل	''اہل عراق کے ایک گروہ نے

۲ جمعہ اور عیدین پر ہم ''کتاب الجمعہ'' میں تفصیل سے بحث کریں گے۔

العراق جاؤوا فقالوا: يا ابن عباس الغسل يوم الجمعة واجب؟ قال: لا ولكنه أطهر وخير لمن اغتسل ومن لم يغتسل فليس عليه بواجب وسأخبرك كيف كان بدء الغسل، كان الناس مجهودين يلبسون الصوف ويعملون على ظهورهم وكان مسجدهم ضيقًا متقارب السقف إنما هو عريش فخرج رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم في يوم حار وعرق الناس في ذلك الصوف حتى ثارت منهم رياح آذى بذلك بعضهم بعضًا فلما وجد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم تلك الريح قال: أيها الناس إذا

حضرت عبداللہ بن عباس سے پوچھا کہ کیا جمعہ کے روز غسل کرنا فرض ہے؟ آپ نے کہا: فرض تو نہیں ہے، مگر جو غسل کرے، اس کے لیے یہ زیادہ پاکیزگی کا باعث اور بہتر ہے اور جو ایسا نہ کر سکے تو (کوئی حرج نہیں) یہ اس پر فرض نہیں۔ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ (جمعہ کے) غسل کا آغاز کس طرح ہوا تھا، عرب لوگ بہت محنت کیا کرتے اور اون کا لباس پہنا کرتے تھے اور اپنی پیٹھوں پر بوجھ اٹھاتے تھے۔ اس وقت مسجد بہت تنگ اور اس کی چھت بہت نیچی ہوتی تھی، (یوں سمجھ لو کہ) وہ بس ایک جھونپڑی تھی۔ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اس دن گرمی کچھ زیادہ تھی تو لوگوں کو اپنے اونی لباس میں پسینا آ رہا تھا جس کی وجہ سے ان کے جسموں

كان هذا اليوم فاغتسلوا ثم جاء الله بالخير ولبسوا غير الصوف وكفوا العمل ووسع مسجدهم وذهب (بعض) الذى كان يوذى بعضهم بعضًا من العرق. (۸۵/۱۰)

سے بدبو آ رہی اور ایک دوسرے کے لیے تکلیف کا باعث بن رہی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا: لوگو، آج کے دن غسل کر کے آیا کرو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کشادگی پیدا کر دی، لوگوں نے اونی لباس پہننے چھوڑ دیے، ان کے کاموں کی نوعیت بدل گئی، مسجد بھی بڑی کر دی گئی اور ان میں سے کچھ وہ لوگ بھی رخصت ہو گئے جن کے پسینے کی بو دوسروں کے لیے باعث اذیت ہوتی تھی۔''

اس روایت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ غسل جمعہ کا حکم دراصل لوگوں کو صاف ستھرا رہنے کی تلقین ہے۔ اسی بنیاد پر عیدین اور عرفات کے اجتماعات میں حاضری کے موقع پر بھی غسل کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو صاف ستھرا رہنے کی عمومی طور پر بڑی تلقین فرمائی ہے۔ ترمذی کی روایت ہے:

إن اللّٰه ... نظيف يحب ''بے شک، اللہ تعالیٰ... پاک صاف

النظافة. (رقم ۲۷۲۳) ہیں اور صاف ستھرا رہنے کو پسند فرماتے ہیں۔''

غسل جمعہ کے باب میں کچھ روایات ایسے الفاظ میں نقل ہوئی ہیں کہ ان سے ایسا کرنا ضروری یا واجب معلوم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر امام بخاری کی ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الغسل یوم الجمعة واجب علی کل محتلم وأن یستن وأن یمس طیبًا إن وجد. (بخاری، رقم ۸۳۱) ''جمعہ کے دن کا غسل ہر بالغ مسلمان کے لیے ضروری ہے اور یہ کہ وہ مسواک کرے اور اگر اس کے پاس خوشبو ہو تو خوشبو لگائے۔''

ہمارے نزدیک اس طرح کی روایات سے غسل کا وجوب یا اس کی فرضیت مراد نہیں، بلکہ یہ الفاظ اس بات کی تلقین وتاکید کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔ ہماری اس رائے کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی دوسری روایات اور جلیل القدر صحابہ کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آپ کا ارشاد ہے:

من توضأ فأحسن الوضوء ثم أتی الجمعة فدنا واستمع وأنصت غفر له ما بینه وبین الجمعة. (ترمذی، رقم ۴۵۸) ''جو شخص اچھی طرح وضو کر کے جمعہ میں حاضر ہوا، اگلی صفوں میں بیٹھا اور اس نے غور سے بات سنی تو اس کی پچھلے جمعہ سے اب تک کی لغزشیں

معاف کردی جائیں گی۔''

بخاری نے اپنی ''صحیح'' میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے، جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ صحابۂ کرام بھی جمعہ کے غسل کو فرض یا واجب نہیں سمجھتے تھے:

عن ابن عمر رضی اللّٰہ عنہما أن عمر بن الخطاب بینما ھو قائم فی الخطبة یوم الجمعة إذ دخل رجل من المھاجرین الأولین من أصحاب النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم فناداہ عمر: أیة ساعة ھذہ قال: إنی شغلت فلم أنقلب إلی أھلی حتی سمعت التأذین فلم أزد أن توضأت، فقال: والوضوء أیضًا وقد علمت أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یأمر بالغسل. (رقم ۸۲۹)

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) جمعہ کا خطبہ دے رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مہاجرین اولین صحابہ میں سے ایک صحابی مسجد میں داخل ہوئے۔ اس پر حضرت عمر نے ان کو آواز دی اور کہا: حضور، کیا وقت ہوا ہے؟ تو انھوں نے جواب میں کہا: میں بہت مصروف تھا اور اذان سننے پر ہی گھر پہنچا اور پھر فوراً وضو کر کے یہاں حاضر ہو گیا۔ اس پر حضرت عمر نے ارشاد فرمایا: اچھا تو آپ وضو کر کے آئے ہیں! حالاں کہ آپ جانتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غسل
کی تلقین کرتے تھے۔''

دوسری روایات سے پتا چلتا ہے کہ مہاجرین اولین میں سے جن صحابی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے۔ اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام جمعہ کے غسل کو فرض یا واجب نہیں سمجھتے تھے، وہاں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غسل جمعہ کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ اس سلسلے میں انھوں نے حضرت عثمان جیسے جلیل القدر صحابی کو بھی ٹوک دیا۔

جمعہ کی طرح عیدین اور عرفات کے اجتماعات میں حاضری کے لیے بھی غسل کرنا چاہیے۔ ابن ماجہ کی روایت ہے:

إن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان یغتسل یوم الفطر ویوم النحر ویوم عرفة.

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عید الفطر، عید الاضحیٰ اور عرفات کے دن غسل کیا کرتے تھے۔''

(رقم ۱۳۰۶)

۲۔ ایک آدمی کا اسلام قبول کرنا ایسا ہی ہے، جیسے اس نے نیا جنم لیا ہو۔ چنانچہ جس طرح ایک بچے کی پیدایش پر اسے نہلا کر صاف کیا جاتا ہے، اسی طرح ایک نومسلم کا غسل اس کی پچھلی زندگی کی آلودگیوں سے صفائی کا ایک علامتی اظہار ہے۔ اسی بات کے پیش نظر روایات سے پتا چلتا ہے کہ کسی شخص کے ایمان لانے پر نبی

صلی اللہ علیہ وسلم اسے غسل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

إن ثمامة بن أثال او أثالة أسلم فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم: إذهبوا به إلى حائط بنى فلان فمروه أن يغتسل. (احمد، رقم ۷۶۹۴)	''ثمامہ بن اثال یا اثالہ نے اسلام قبول کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کو بنوفلاں کے احاطے میں لے جاؤ اور اس سے کہو کہ یہ غسل کرے۔''

جمعہ، عیدین اور عرفات کے دن اور کسی شخص کے ایمان لانے پر غسل کرنا فرض تو نہیں ہے، مگر چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان موقعوں پر غسل کی تلقین کی ہے، لہٰذا ہمیں ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔

خلاصۂ بحث

اوپر کی ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں جن موقعوں پر غسل کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ جنبی کے لیے نماز پڑھنے سے پہلے،
۲۔ جنبی کے لیے مسجد جانے سے پہلے،
۳۔ جنبی کے لیے قرآن پڑھنے یا اسے چھونے سے پہلے،

۴۔ حیض اور نفاس کا خون ختم ہونے پر۔

فصل ۲: غسل کا طریقہ

'غسل' کا مطلب اپنا جسم دھونا ہے۔ چنانچہ سارا جسم دھو لینے سے غسل کے باب میں شریعت کا حکم پورا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ غسل میں صرف یہی ضروری ہے کہ پورا جسم دھل جائے، اس کے علاوہ کسی اور چیز پر غسل کی صحت یا عدم صحت کا انحصار نہیں ہے۔ یہی بات فقہا کی اصطلاح میں بیان کی جائے تو یوں ہوگی کہ ہمارے نزدیک غسل میں فرض یا واجب صرف یہی ہے کہ آدمی اچھی طرح اپنا سارا جسم دھو لے۔ 'اچھی طرح' دھونے کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غسل کا حکم دیتے ہوئے مبالغے کے صیغے 'اِطَّهَّرُوْا' اور 'اِغْتَسِلُوْا' استعمال کیے ہیں جن سے اس میں اچھی طرح دھونے کی شرط پیدا ہوگئی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اپنا سارا جسم اچھی طرح دھو لیتا ہے تو اس نے شریعت کا حکم پورا کر دیا۔

سارا جسم دھو لینے سے اگرچہ غسل کے باب میں شریعت کا حکم پورا ہو جاتا ہے، مگر کیا غسل کا کوئی ایسا طریقہ بھی ہے جس سے یہ فریضہ احسان[۳] کے درجے میں پورا ہو

---

[۳] اس موقعے پر یہ بات بڑی اچھی طرح سے سمجھ لینی چاہیے کہ دین میں احکام بجالانے یا عمل کرنے کے دو درجے ہیں: ایک یہ کہ آدمی حکم کا منشا پورا کر دے اور دوسرا یہ کہ آدمی اس

سکے؟ اس بات کا جواب ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت میں ملتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غسل

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا طریقہ حدیث کی تمام کتابوں میں نقل ہوا ہے۔ ان سب روایتوں کو جمع کرنے سے آپ کے غسل کی جو صورت سامنے آتی ہے، اس کو ہم یہاں ایک ترتیب کے ساتھ درج کیے دیتے ہیں:

حکم کو اس کی بہترین شکل میں انجام دے۔ اس دوسری صورت کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر 'احسان' کے رویے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

صاحب ''تدبر قرآن'' مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

> ''...عربی میں 'احسن الی فلان' کے معنی ہوں گے فلاں کے ساتھ احسان کیا اور 'احسن الشیٔ' کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا۔ اس وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لیے بھی۔'' (۲۲۰/۱)

یہ بات ایک مثال سے یوں سمجھیے کہ قرآن مجید میں جگہ جگہ مسلمانوں کو انفاق پر ابھارا گیا ہے۔ چنانچہ جو شخص بھی اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، وہ انفاق کرتا ہے، مگر جس شخص نے فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ اپنا بہترین اور عزیز ترین مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اس نے یہ انفاق احسان کے درجے میں کیا۔

۱۔سب سے پہلے آپ اپنے ہاتھ دھوتے۔(مسلم،رقم ۴۷۴)

۲۔اس کے بعد دائیں ہاتھ سے پانی ڈالتے اور بائیں ہاتھ سے اپنی شرم گاہ کو اچھی طرح سے دھوتے۔(مسلم،رقم ۴۷۴)

۳۔اس کے بعد اپنے ہاتھوں کو مٹی یا دیوار سے رگڑ کر صاف کرتے[۴]۔
(مسلم،رقم ۴۷۶)

۴۔پھر سوائے پاؤں دھونے کے، پورا وضو کرتے۔(ترمذی،رقم ۹۶)

۵۔پھر اچھی طرح سے مل کر اپنے بال دھوتے۔(مسلم،رقم ۴۷۶)

۶۔اس کے بعد تین مرتبہ پانی بہا کر ہاتھوں سے ملتے ہوئے سارا جسم صاف کرتے۔(المحلّٰی ۳۱/۲)

۷۔پھر غسل کی جگہ سے کچھ ہٹ کر اپنے پاؤں دھوتے۔(مسلم،رقم ۴۷۶)

اس کے علاوہ روایتوں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے بارے میں جو مزید

---

[۴] یہاں پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو چیزیں تمدنی ترقی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، ان کے استعمال میں ہم اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے تبدیلی کر سکتے ہیں، اس طرح کے معاملات میں دین کا اصولی تقاضا پیش نظر رہنا چاہیے۔مثال کے طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل سے اصولی ہدایت یہ ملتی ہے کہ شرم گاہ دھونے کے بعد آپ اچھی طرح سے ہاتھ صاف کیا کرتے تھے یا یہ کہ غسل میں آپ اپنے بالوں کو اچھی طرح دھویا کرتے تھے۔اس حکم کو پورا کرنے کے لیے آج ہم صابن اور شیمپو وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔

معلومات ملتی ہیں، وہ یہ ہیں:

ا۔ دائیں جانب سے ابتدا کرنا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام دائیں جانب سے شروع کرنے کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ جن روایات میں آپ کے غسل کا طریقہ بیان ہوا ہے، ان میں بھی یہ بات نقل ہوئی ہے کہ آپ ہاتھ دھوتے تو پہلے دایاں اور اس کے بعد بایاں دھوتے۔ مسلم کی روایت ہے:

قالت عائشة: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم إذا اغتسل بدأ بيمينه فصب عليها من الماء فغسلها. (رقم ۴۸۲)

''حضرت عائشہ فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل کرتے تو دائیں ہاتھ سے شروع کرتے اور (سب سے پہلے) اس پر تھوڑا سا پانی ڈال کر اسے دھوتے۔''

یہاں تک کہ حضرت عائشہ کے بقول:

فبدأ بشق رأسه الأيمن ثم الأيسر. (ابوداؤد، رقم ۲۰۸)

''آپ پہلے اپنے سر کا دایاں حصہ اور اس کے بعد بایاں حصہ دھوتے تھے۔''

یہ تمام روایات، جن میں کاموں کو داہنے ہاتھ سے کرنے یا دائیں جانب کا خیال رکھنے کے بارے میں تعلیم دی گئی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت متواترہ پر مبنی ہیں۔ اس طرح کی تعلیمات کا تعلق اسلامی معاشرت کی تہذیبی روایات سے ہے۔

ب۔ پانی کم سے کم استعمال کرنا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کی روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ آپ غسل میں کم سے کم پانی استعمال فرماتے تھے۔ اگرچہ روایات میں آپ کے غسل میں استعمال ہونے والے پانی کی کوئی متعین مقدار بیان نہیں ہوئی، مگر یہ بات، بہرحال واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نہایت کم پانی سے بہت اچھی طرح غسل کر لیتے تھے۔ مثال کے طور پر کچھ روایات میں اس پانی کی مقدار ایک صاع[5]، کچھ میں تین صاع[6]، کچھ میں آٹھ رطل[7] اور کچھ میں تین مد[8] بیان ہوئی ہے۔

اس معاملے میں اصولی بات یہ ہے کہ اسراف کسی چیز میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اسراف کو شیطانی فعل قرار دیا ہے۔ اسراف کسی متعین مقدار کا نام نہیں، بلکہ ایک رویے اور طرز عمل کا نام ہے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل میں استعمال ہونے والے پانی کی مقدار کا تعین تو نہیں کیا، مگر یہ واضح کر دیا ہے کہ اس میں اسراف، بہرحال نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا اس معاملے میں پانی کی

---

5 بخاری، رقم ۱۹۴۔ اگرچہ ان پیمانوں کے تعین میں اختلاف ہے، مگر رائج نقطۂ نظر کے مطابق ایک صاع اڑھائی کلو سے کچھ زیادہ ہوگا۔

6 مسلم، رقم ۴۸۰۔

7 نسائی، رقم ۲۲۶۔ آٹھ رطل: چار کلو سے کچھ زیادہ۔

8 مسلم، رقم ۴۸۳۔ تین مد: ڈیڑھ کلو سے کچھ زیادہ۔

مقدار کو نہانے والے پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بس اتنی بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ:

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ وَکَانَ الشَّیْطٰنُ لِرَبِّہٖ کَفُوْرًا. (بنی اسرائیل ۱۷:۲۷)	''بے شک، اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔''

ج۔ اوٹ میں غسل کرنا

روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے وقت کسی چیز کو ستر بنا لیتے تھے تاکہ گزرنے والوں کو آپ کا جسم نظر نہ آئے۔ حضرت میمونہ فرماتی ہیں:

وضعت للنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ماء وسترتہ فاغتسل. (مسلم، رقم ۵۱۱)	''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کے لیے پانی رکھا اور ان کے لیے پردہ کر دیا، پھر آپ نے غسل کیا۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معاملے میں یہ ہدایت بھی فرمائی:

لا ینظر الرجل إلی عورۃ الرجل ولا تنظر المرأۃ الی عورۃ المرأۃ. (فقہ السنہ ۱/۶۵)	''مرد، مرد کی شرم گاہ نہ دیکھے اور عورت، عورت کی شرم گاہ بھی نہ دیکھے۔''

اوٹ میں غسل کرنے کی تعلیم قرآن مجید اور عقل وفطرت کے مسلمات پر مبنی ہے۔

قرآن مجید میں مومنین کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ. (المومنون ۲۳:۵) ''اور (یہ لوگ) اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مسلمانوں کو حیا کی بہت تعلیم دی ہے، آپ کا ارشاد ہے:

الحیاء من الإیمان. ''حیا ایمان کا حصہ ہے۔''

(بخاری، رقم ۲۳)

اسی بات کو ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا:

لکل دین خلق، و خلق الإسلام الحیاء. (موطا، رقم ۱۴۰۶) ''ہر دین کی ایک مخصوص خصلت ہے، اسلام کی خصلت حیا ہے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی فطرت میں جو شرم وحیا موجود ہے، برائی کی راہ اختیار کرنے میں یہی اس کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ چنانچہ اگر کبھی یہ رکاوٹ ختم ہو جائے تو پھر بلیغ سے بلیغ وعظ اور دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے نصیحت آمیز کلمات بھی انسان پر کوئی اثر نہیں کر سکتے۔ جس شخص نے اپنی فطرت کو مسخ نہیں کیا، اس کے دل میں ایمان بھی گھر کر لے گا اور جس نے حیا کا لبادہ اتار پھینکا، وہ اس راہ پر چل نکلا جس کی منزل 'خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ

وَعَلٰٓی اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ[9] ہے۔

شہری زندگی میں گھروں کے اندر غسل خانوں کی تعمیر سے اب ستر کا مسئلہ تو حل ہو جاتا ہے، مگر دیہاتی زندگی میں اس طرح کی سہولتیں آج بھی موجود نہیں ہیں۔ چنانچہ اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ آدمی کسی دیوار یا کپڑے کی اوٹ میں غسل کرے۔

فصل ۳: تنبیہات

۱۔ جسم کا کچھ حصہ دھلنے سے رہ جانا

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید میں غسل کے لیے مبالغے کے صیغے 'اِغۡتَسِلُوۡا' اور 'اِطَّهَّرُوۡا' استعمال ہوئے ہیں، جن سے یہ بات نکلتی ہے کہ غسل کرنے والے کو پورے اہتمام کے ساتھ اپنا سارا جسم دھونا چاہیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی بہت تاکید فرمائی ہے کہ غسل کرنے والے کو اپنا سارا جسم بڑی اچھی طرح دھونا چاہیے۔ آپ کا ارشاد ہے:

إن تحت كل شعرة جنابة فاغسلوا الشعر وأنقوا البشر. (ابوداؤد، رقم ۲۱۶)

''جسم کے ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ چنانچہ اپنے بالوں کو اور اپنے سارے جسم کو اچھی طرح دھوو۔''

---

[9] البقرہ ۲: ۷۔ ''اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔''

چنانچہ غسل کرتے وقت آدمی کو یہ اہتمام کرنا چاہیے کہ سارا جسم اچھی طرح دھل جائے۔ اگر پوری احتیاط کے باوجود جسم کا کوئی حصہ دھلنے سے رہ جائے تو اسے دھو لینا چاہیے یا جسم یا بالوں پر لگا ہوا پانی اس پر مل لینا چاہیے۔ اس صورت میں غسل دہرانے کی ضرورت نہیں ہے:

عن عبد اللّٰه بن مسعود أن رجلًا جاء إلى رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم فسئله عن رجل يغتسل من الجنابة فيخطئ بعض جسده الماء فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: يغسل ذٰلك المكان ثم يصلى.
(اعلاء السنن ۱/۱۴۱)

''عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر یہ استفسار کیا کہ اگر کوئی جنابت کا غسل کرتا ہے اور غلطی سے اس کے جسم کا کچھ حصہ دھلنے سے رہ جاتا ہے تو پھر اسے کیا کرنا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اس جگہ کو دھولے، پھر نماز ادا کرلے۔''

إغتسل رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من جنابة فلما خرج رأى لمعة على منكبه الأيسر لم يصبها الماء فأخذ

''ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کا غسل کرکے باہر تشریف لائے تو انھوں نے اپنے بائیں کندھے پر تھوڑی سی جگہ ایسی دیکھی جو دھلنے

من شعره فبلها ثم مضى إلى الصلوٰة. (احمد، رقم ۲۰۷۱)

سے رہ گئی تھی۔ اس پر آپ نے اپنے بالوں کی ایک لٹ نچوڑ کر اس جگہ کو بھگو دیا اور مسجد کی طرف چل پڑے۔''

غور کیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیتے وقت یہ فرمایا کہ غسل کرنے میں پوری احتیاط ملحوظ رہنی چاہیے اور پورا جسم بڑی اچھی طرح سے دھل جانا چاہیے، جبکہ اس احتیاط کے باوجود جسم کا کچھ حصہ دھلنے سے رہ جائے تو پھر یہ سختی نہیں کی کہ دوبارہ غسل کا حکم دیا ہو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس حصے پر پانی بہا لینا کافی ہے۔ اس بات سے دین میں مطلوب رویہ بھی سامنے آتا ہے کہ انسان کو حکم بجالانے میں پوری احتیاط کرنی چاہیے، مگر اس احتیاط کے باوجود اس سے اگر کوئی غلطی ہو جائے یا کوئی کمی رہ جائے تو اس میں دین اس پر بے جا بوجھ نہیں ڈالتا۔

اس رخصت کی اساس قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے، خود قرآن ہی کی رو سے ایک استثنا کے ساتھ مشروط ہیں، قرآن کا ارشاد ہے:

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ ۲: ۲۳۳)

''کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلّف نہیں ٹھہرایا جاتا۔''

اسی طرح وضو، غسل اور تیمّم کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

اس طرح کی رخصتیں دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف دین کو بہت آسان بنا دیا ہے، بلکہ اس کے قانونی پہلو اور اس کی حکمت میں توازن بھی قائم کر دیا ہے۔ اگر ہمارے دین میں اس طرح کی رخصتیں موجود نہ ہوتیں تو یہ بھی یہودیت کی طرح حکمت سے خالی محض ایک قانون بن کر رہ جاتا۔ آئندہ آنے والے مباحث میں یہ بات مزید واضح ہو جائے گی کہ اسلامی تعلیمات میں کس طرح ایک عام آدمی کی نفسیات کا خیال رکھا گیا اور کیسے اس کے لیے دین کی پیروی آسان بنا دی گئی ہے۔

۲۔ جنابت کے بعد غسل میں تاخیر

ایک مسلمان کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیے کہ وہ ہر وقت پاک رہے۔ چنانچہ حالت جنابت میں جتنی جلدی ممکن ہو، غسل کر لینا چاہیے۔ اس بات کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بہت تاکید فرمائی ہے، آپ نے فرمایا:

لا تدخل الملائكة بيتًا فيه ... جنب. (ابوداؤد، رقم ۱۹۶، ۳۶۲۲)

''اس گھر میں فرشتے نہیں آتے جس میں... کوئی جنابت سے ہو۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ جو لوگ اپنی طہارت کا خیال نہیں رکھتے اور اس سے بے پروا رہتے ہیں، ان کے پاس اللہ کی رحمت کے فرستادے اس کی عنایتوں کے ساتھ نہیں آتے۔

اس باب کی پہلی فصل میں غسل کی فرضیت بیان کرتے ہوئے ہم یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ ایک جنبی کے لیے نماز پڑھنے اور مسجد جانے سے پہلے غسل کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے وہ جنابت لاحق ہونے کے فوراً بعد غسل نہیں کرتا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

متعدد روایات میں یہ بات نقل ہوئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اگر کسی وجہ سے حالت جنابت میں فوراً غسل نہ کرتے تو آپ اپنی شرم گاہ دھو کر وضو کر لیا کرتے تھے:

عن عائشة قالت: كان النبي صلى الله عليه وسلم إذا أراد أن ينام وهو جنب غسل فرجه وتوضأ للصلوٰة.	''حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حالت جنابت میں سونے کا ارادہ کرتے تو اپنی شرم گاہ دھوتے اور نماز کی طرح کا وضو کر لیتے۔''

(بخاری، رقم ۲۷۹)

اسی طرح ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ سے احتلام کے بارے میں دریافت کیا تو اس پر بھی آپ نے یہی فرمایا:

توضأ واغسل ذكرك ثم	''(اس صورت میں) تم وضو کر لو اور

نم. (بخاری، رقم ۲۸۱) اپنی شرم گاہ دھولو، پھر (بے شک) سو جاؤ۔''

روایات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص مباشرت کے بعد دوبارہ اپنی بیوی سے صحبت کرنا چاہے تو اسے بھی چاہیے کہ وہ وضو کر لے۔ مسلم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إذا أتى أحدكم أهله ثم أراد أن يعود، فليتوضأ. (مسلم، رقم ۴۶۶) ''اگر تم اپنی بیوی سے مباشرت کے بعد دوبارہ صحبت کرنا چاہو تو وضو کر لیا کرو۔''

اس بات کا تعلق ہمارے ایمان، سلامتی طبع اور پاک طینتی سے ہے۔ جسم پر لگی ہوئی نجاست ایک سلیم الفطرت آدمی کو اس وقت تک پریشان رکھتی ہے، جب تک یہ نجاست دھل نہیں جاتی۔ اس حالت میں وہ اپنے اندر ایک کمی محسوس کرتا ہے۔ آدمی جتنا پاکیزہ صفت ہوگا، کمی کا یہ احساس اتنا ہی شدید ہوگا۔ ایک مومن جو بھلائیاں حالت طہارت میں پا سکتا تھا، اس حالت میں ان کو نہ پانے کا خیال، اسے کچھ چھن جانے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ یہی احساس ایک آدمی کو اس طہارت کے عمل پر ابھارتا ہے جس کا اہتمام اوپر والی روایات کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔

اس اہتمام کی دوسری وجہ یہ ہے کہ رات کو سونا ایک طرح سے موت کی تمثیل ہے۔

جب آدمی رات کو سویا تو کیا معلوم کہ اس کی صبح ہوگی یا نہیں۔ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے موقعوں پر نیند کو موت سے بھی تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ وہ آدمی جو خدا کے لیے مرنے اور جینے کا عہد کیے ہوئے ہے، اسے اس احساس کے ساتھ سونا چاہیے، گویا وہ خدا کے حضور پیش ہو رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما أحب أن يرقد وهو جنب حتى يتوضأ، فإني أخشى أن يتوفى فلا يحضره جبرئيل عليه السلام. (اعلاء السنن ۱/۱۷۰)

''بہتر یہ ہے کہ جب کوئی شخص جنابت کی حالت میں سونے لگے تو وضو کر لے، کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر کہیں وہ (جنابت کی حالت میں) مر گیا تو اس کے پاس جبرئیل علیہ السلام نہ آئیں گے۔''

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس حکم کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اسے واجب قرار دیا جائے۔ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حالت جنابت میں سونے سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً وضو کر لیا کرتے تھے، مگر روایات سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آپ حالت جنابت میں وضو کیے بغیر ہی سو گئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم ينام وهو جنب ولا يمس ماء. (ترمذی، رقم ۱۱۰)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر پانی کو ہاتھ لگائے سو جایا کرتے تھے، جبکہ وہ حالت جنابت میں ہوتے تھے۔''

اسی طرح ایک اور روایت میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

كان النبى صلى الله عليه وسلم يجامع ثم يعود ولا يتوضأ. (اعلاء السنن ۱۶۸/۱)	”نبی صلی اللہ علیہ وسلم مباشرت کرتے اور پھر بغیر وضو کے دوبارہ صحبت کر لیتے۔“

ان روایات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جنابت کے بعد سونے سے پہلے وضو کرنا واجب ہے نہ فرض۔ زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عموماً اس بات کا خیال رکھتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ اس تعلیم کی نوعیت ایسی ہی ہے، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رات میں سونے سے پہلے دعا مانگنے کی تعلیم دی ہے۔ ظاہر ہے کہ دعا مانگنا فرض نہیں ہے۔ ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص اس کو اپنا معمول نہیں بناتا، وہ بہت بڑے خیر سے محروم رہتا ہے۔

۳۔ غسل کے بعد وضو کرنا

قرآن مجید میں جس ترتیب کے ساتھ وضو اور غسل کے احکام آئے ہیں، ان سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ غسل کر لینے کے بعد وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے غسل کر لیا ہے، خواہ یہ جنابت کا غسل ہو یا نہ ہو تو اس کے بعد اس کو نماز ادا کرنے کے لیے وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔

سورۂ مائدہ (۵) کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ نماز ادا کرنے سے پہلے عام حالات میں صرف وضو ہی کرنا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص حالت جنابت میں ہو

تو اسے وضو نہیں، بلکہ غسل کرنا ہوگا۔ غور کیجیے تو وضو اور غسل کے اس حکم کی ترتیب ہی سے یہ بات نکلتی ہے کہ جنابت ایک ایسی بڑی نجاست ہے جس کے بعد نماز کے لیے آدمی اس وقت تک پاک نہیں ہوتا، جب تک وہ غسل نہ کر لے۔ چنانچہ اگر جنابت کے بعد غسل سے آدمی پاک ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی دوسری نجاست کے بعد غسل کر لینے سے تو وہ بدرجۂ اتم پاک ہو جائے گا۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی معلوم ہوتی ہے:

عن عائشة أن النبی صلی اللّٰه علیه و سلم کان لا یتوضأ بعد الغسل. (ترمذی، رقم ۱۰۰)

''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غسل کرنے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔''

۴۔ کسی کے بچے ہوئے پانی سے غسل

پانی کم ہونے کی وجہ سے ایک آدمی کو مجبوراً کسی کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کے غسل کے بعد، ان کے بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کر لیا کرتے تھے۔ ابن عباس کی روایت ہے:

إن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم کان یغتسل بفضل میمونة

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت میمونہ (رضی اللہ عنہا) کے غسل کے

میمونة. (مسلم، رقم ۴۸۷) بچے ہوئے پانی سے غسل کرلیا کرتے تھے۔''

اسی طرح روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم جنابت کی حالت میں ایک ہی برتن سے غسل کرلیا کرتے تھے۔

حضرت عائشہ سے روایت ہے:

كنت أغتسل أنا ورسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم من إناء بيني وبينه واحد فيبادرني حتى أقول: دع لي دع لي قالت: وهما جنبان. (مسلم، رقم ۴۸۵)

''میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک برتن سے، جو ہمارے درمیان پڑا ہوتا، غسل کرلیا کرتے تھے۔ جب آپ جلدی جلدی پانی ڈالتے تو میں کہتی کہ میرے لیے بھی چھوڑ دیں، میرے لیے بھی چھوڑ دیں، وہ فرماتی ہیں کہ اس وقت ہم دونوں حالت جنابت میں ہوتے۔''

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی مجبوری کے باعث شوہر اور بیوی اکٹھے غسل کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔[۱۰]

۱۰؎ قرآن مجید میں شوہر اور بیوی کے تعلق کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ. (البقرہ ۲: ۱۸۷) ''تمھاری بیویاں تمھارے لیے بمنزلۂ لباس ہیں اور تم ان کے لیے

اگرچہ کسی کے بچے ہوئے پانی سے غسل کر لینے پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، مگر انسان کو یہ شک لاحق ہوسکتا ہے کہ جس پانی سے اس نے غسل کیا، وہ پاک تھا بھی یا نہیں۔ سنن ابوداؤد میں ابن عباس سے روایت ہے:

إغتسل بعض أزواج النبي صلى الله عليه وسلم في جفنة فجاء النبي صلى الله عليه وسلم ليتوضأ منها أو يغتسل، فقالت له: يا رسول الله إني كنت جنبًا فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إن الماء لا يجنب. (رقم ٦٢)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات میں سے کسی نے غسل کیا، اس کے بعد آپ آئے اور بچے ہوئے پانی سے وضو یا غسل کرنے لگے تو انھوں نے کہا: یارسول اللہ، میں جنابت سے تھی۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پانی تو جنبی نہیں ہوتا۔''

یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شک دور کر دیا ہے کہ اگر غسل کرنے والا احتیاط سے غسل کرے تو اس کا بچا ہوا پانی پاک ہے۔ چنانچہ غسل کرتے وقت اس بات کا

بمنزلۂ لباس ہو۔''

قرآن مجید کے ان الفاظ سے جہاں اور بہت سی باتیں نکلتی ہیں، وہاں ایک اہم بات یہ بھی نکلتی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت جب نکاح کے رشتے میں بندھ جاتے ہیں تو ان کے درمیان کسی قسم کا حجاب باقی نہیں رہتا۔

خاص خیال رکھنا چاہیے کہ پانی کے چھینٹے برتن میں نہ پڑیں تا کہ پانی گندا نہ ہو جائے۔

فصل ۴: رخصتیں

۱۔ مرض، سفر اور پانی نہ ملنے کی صورت میں رخصت

قرآن مجید میں وضو اور غسل کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ رخصت دی ہے کہ اگر ان کو کوئی ایسا مرض ہو یا چوٹ لگی ہو جس کے لیے پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو وہ وضو یا غسل کے بجائے تیمّم کر لیں۔ یہ رخصت مرض کے ساتھ ساتھ سفر کی صورت میں اور پانی نہ ملنے یا اس کی قلت کی صورت میں بھی دی گئی ہے۔

اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اگر کسی خاص عضو میں ایسی تکلیف ہو جس کو پانی سے بچانا ہو تو اس صورت میں یہ رخصت اس عضو کے لیے ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر اگر کسی کے پاؤں میں کوئی زخم ہو تو وضو میں اس کے لیے پاؤں دھونا ضروری نہیں اور غسل میں وہ اپنے پاؤں پر کوئی چکنائی لگا سکتا ہے جس سے اس کا زخم پانی سے محفوظ ہو جائے۔

یہی بات اس روایت میں بھی بیان ہوئی ہے:

عن عطاء بن أبی رباح قال:	''عطاء بن ابی رباح کہتے ہیں کہ
سمعت ابن عباس یخبر أن	میں نے حضرت عبداللہ بن عباس کو
رجلًا أصابه جرح فی رأسه	یہ بیان کرتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ

على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، ثم أصابه إحتلام فأمر بالإغتسال فاغتسل، فكز، فمات فبلغ ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: قتلوه قتلهم الله أو لم يكن شفاء العى السوال قال عطاء: وبلغنا أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: لو غسل جسده وترك رأسه حيث أصابه الجراح. (ابن ماجہ، رقم ۵۶۵)

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص کے سر میں چوٹ لگ گئی۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کو احتلام ہوا تو لوگوں نے اسے غسل کرنے کو کہا۔ چنانچہ اس نے غسل کیا، جس کی وجہ سے وہ کزاز کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا پتا چلا تو آپ نے فرمایا: اللہ ان کو تباہ کرے، اسے انھوں نے مار ڈالا۔ کیا سوال کر لینا ان کی جہالت کا علاج نہیں تھا؟ عطاء کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ کاش، وہ اپنے سر کے اس حصے کے علاوہ، جہاں اس کو چوٹ آئی تھی، سارا جسم دھو لیتا۔''

۲۔ عورت کے لیے مینڈیاں[۱۱] کھولنے میں رخصت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو یہ رخصت دی ہے کہ ان کو غسل میں اپنے بالوں

[۱۱] بالوں کی لٹوں سے پتلی پتلی بہت سی چوٹیاں گوندھنا۔

کی مینڈیاں کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید میں وضو اور غسل کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکرگزار ہو۔''

مینڈیاں باندھنا یا انھیں کھولنا، چونکہ باعث حرج ہوسکتا ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کے اس حصے کی بنیاد پر مسلمان خواتین کو یہ رخصت دی ہے کہ وہ غسل میں اپنی مینڈیاں نہ کھولیں۔ مسلم کی روایت ہے:

عن أم سلمة قالت: قلت: يا رسول الله إني إمرأة أشد ضفر رأسي أفأنقضه لغسل الجنابة؟ قال: لا إنما يكفيك أن تحثي على رأسك ثلاث حثيات ثم تفيضين عليك الماء فتطهرين. (مسلم، رقم ۴۹۷)

''ام سلمہ سے روایت ہے، انھوں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا کہ میں اپنے بالوں کی مینڈیاں باندھتی ہوں۔ کیا غسل جنابت میں مجھے ان کو کھول لینا چاہیے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، تمھارے لیے بس یہی کافی ہے کہ تم اپنے بالوں کو تین لپ[۱۲] پانی ڈال کر (اچھی طرح سے)

[۱۲] وہ مقدار جو دونوں ملی ہوئی ہتھیلیوں میں آجائے۔

دھولو، اس کے بعد اپنے پورے جسم پر
پانی بہا کر اپنے آپ کو پاک کرلو۔''

هذا ما عندی و العلم عند اللّٰہ۔

[۱۹۹۳ء]

'مدیر' کے نام

محترم

السلام علیکم

''اشراق''، اپریل ۱۹۹۳ کے شمارے میں 'ایک برتن سے زوجین کے غسل' سے متعلق حدیث کی توضیح کرتے ہوئے معزامجد شیخ صاحب نے صفحہ ۲۱ پر تحریر کیا ہے کہ ''اگر کسی مجبوری کے باعث شوہر اور بیوی اکٹھے غسل کر لیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔'' یہاں معز صاحب نے ''کسی مجبوری کے باعث'' کی شرط کس بنیاد پر لگائی ہے؟ نہ متن حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کسی ایسی مجبوری کا ذکر کیا، اور نہ حاشیے میں درج سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ اس کی تائید کرتی ہے، بلکہ اس آیت سے خود معز صاحب نے جو اہم نتیجہ اخذ کیا ہے، زوجین کے درمیان کسی قسم کے حجاب کے باقی نہ رہنے کا، وہ بھی ان کی اس ''مجبوری کے باعث'' والی شرط کو دین میں ایک بے جواز اضافہ ثابت کر رہا ہے۔ اگر اس شرط کی قرآن وحدیث میں کوئی بنیاد

ہے، تو ہماری رہنمائی فرمائیں، ورنہ اپنی ذاتی رائے کو قارئین کے سامنے فقہ بنا کر نہ پیش کریں۔

مصباح الاسلام
ریاض۔سعودی عرب

مکرمی ومحترمی، مصباح الاسلام صاحب
السلام علیکم

''باب الغسل'' کی ایک عبارت کے بارے میں آپ کا تجزیہ، بذریعہ ڈاکٹر منیر احمد صاحب، موصول ہوا۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ ہماری معروضات کا اتنے غور سے مطالعہ فرماتے ہیں۔

آپ نے زوجین کے اکٹھے غسل کرنے کے بارے میں ہماری عبارت پر جو اعتراض فرمایا ہے، اس میں کافی وزن ہے۔ آپ کی نشان دہی کے بعد غور کرنے سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ زیر بحث عبارت میں ''مجبوری کے باعث'' کے الفاظ مناسب نہیں۔ جزاك الله خيرًا ۔مگر ہماری اس غلطی سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ ہم قرآن وسنت کی سند کے بغیر اپنی آرا کو اسلامی فقہ بنا کر پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں، شاید بے جا ہے۔

ہمارے دین میں شرم وحیا کی اہمیت کسی سے مخفی نہیں ہے۔ اگر چہ ایک مرد اور ایک عورت کے شوہر اور بیوی بن جانے کے بعد ان کے درمیان کسی قسم کا حجاب باقی نہیں

رہتا، مگر اس سے یہ نتیجہ نکال لینا بھی صحیح نہیں کہ اس رشتے میں جڑ جانے کے بعد ان کو اپنی فطرت میں موجود حیا کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔

آپ نے ہمارے مضمون سے جس روایت کا حوالہ دیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے یہ بات تو معلوم نہیں ہوتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر اپنی ازواج کے ساتھ ہی غسل فرماتے تھے اور نہ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شوہر اور بیوی کو عام طور پر ایک دوسرے کے سامنے بے حجاب ہی رہنا چاہیے۔ البتہ ہم اس بات کا ایک مرتبہ پھر اعتراف کرتے ہیں کہ ''کسی مجبوری کے باعث'' والا جملہ بات کی صحیح تعبیر کے لیے غیر موزوں ہے۔ چنانچہ ہم زیر بحث عبارت میں کوئی ایسی مناسب تبدیلی کیے دیتے ہیں جس سے، ان شاء اللہ، آپ کا اعتراض بھی دور ہو جائے گا اور ہم اپنی ذاتی آرا کو دین بنانے کے مجرم بھی قرار نہ پائیں گے۔

امید ہے آپ آیندہ بھی اپنی قیمتی آرا اور تنقیدات سے مستفید فرماتے رہیں گے۔

دعا گو

معز امجد

المورد

۹۸ (۲) ای ماڈل ٹاؤن، لاہور

[نومبر ۱۹۹۳ء]

باب التیمم

جعلت لی الأرض مسجدًا و طهورًا[1]

پچھلے ابواب میں[2]، وضو اور غسل کا قانون تفصیل سے بیان ہو گیا ہے۔ اس قانون کو پیش نظر رکھیے تو پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ طہارت حاصل کرنے کا اولین اور فطری ذریعہ پانی ہی ہے، لیکن ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ بارہا ایسے حالات پیش آ جاتے ہیں جن میں پانی میسر ہی نہیں ہوتا یا اتنی کم مقدار میں میسر ہوتا ہے کہ اس سے طہارت حاصل کرنا بہت مشکل یا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں کسی مشقت میں ڈالنے کے بجاے اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے، امت مسلمہ کو 'تیمّم' کے طریقے سے طہارت حاصل کر لینے کی رخصت دے دی ہے۔

---

[1] بخاری، رقم ۳۲۳۔ ''میرے لیے یہ پوری زمین مسجد اور طہارت کا ذریعہ بنا دی گئی ہے۔''

[2] ملاحظہ فرمایئے: باب الوضو، ماہنامہ اشراق، اگست، ستمبر ۱۹۹۲ء۔ باب الغسل، ماہنامہ اشراق، جنوری، اپریل ۱۹۹۳ء۔ باب المیاہ، ماہنامہ اشراق، فروری ۱۹۹۴ء۔

چنانچہ اسلامی شریعت میں 'تیمّم' طہارت حاصل کرنے کا وہ طریقہ ہے جو پانی کی کمی یا کسی اور مجبوری کی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے۔

فصل ۱: تیمّم کا قانون

قرآن مجید میں جہاں نماز کے لیے عام حالات میں وضو اور جنابت کی حالت میں غسل کا حکم دیا گیا ہے، اسی مقام پر تیمّم کی یہ رخصت بھی بیان کر دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ	''اے ایمان والو، جب تم نماز کی
اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ	تیاری کے لیے اٹھو تو اپنے چہرے اور
وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا	اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوو اور اپنے
بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى	سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں ٹخنوں
الْكَعْبَيْنِ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا	تک دھوو۔ اور اگر حالت جنابت میں
فَاطَّهَّرُوْا وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى	ہو تو غسل کرو، اور اگر تم مریض ہو یا سفر
اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ	میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور
مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ	سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ملاقات
فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا	کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی دیکھ
طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ	کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر

وَاَیۡدِیۡکُمۡ مِّنۡهُ مَا یُرِیۡدُ اللّٰهُ	اس سے مسح کرلو۔ اللہ یہ نہیں چاہتا کہ
لِیَجۡعَلَ عَلَیۡکُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ	تمھیں کسی تنگی میں ڈالے، بلکہ وہ چاہتا
وَّلٰکِنۡ یُّرِیۡدُ لِیُطَهِّرَکُمۡ وَلِیُتِمَّ	ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی
نِعۡمَتَهٗ عَلَیۡکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ.	نعمت تمام کرے، تاکہ تم شکرگزار بنو۔''

(المائدہ ۵:۶)

اس آیت کی بنیاد پر تیمّم کے بارے میں جو قانون بنتا ہے، اس کی مختلف دفعات ہم یہاں، ایک ترتیب کے ساتھ درج کیے دیتے ہیں:

ا۔ جواز تیمّم کے اسباب

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وضو کے بدلے میں تیمّم کر لینے کی رخصت کون کون سے حالات میں دی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ آیۂ زیر بحث کا مفہوم پوری طرح واضح کر دیا جائے۔

سورۂ مائدہ کی اس آیت پر ایک نگاہ ڈالنے سے کسی کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اس میں پانی نہ ہونے کی شرط چاروں مذکورہ صورتوں سے متعلق ہے، یعنی آیت کا مفہوم یہ ہے:

> ''اگر تم مریض ہو، اور پانی نہ پاؤ یا سفر میں ہو، اور پانی دستیاب نہ ہو یا رفع حاجت کی ہو، اور پانی نہ ہو یا عورت سے ملاقات کی ہو اور غسل کے لیے پانی موجود نہ ہو تو تیمّم کرو۔''

ظاہر ہے، اگر آیت کے یہ معنی ہوتے تو کوئی شخص مریض ہو، مسافر ہو، اس نے رفع حاجت کی ہو یا وہ جنابت کی حالت میں ہو، بہرحال تیمّم وہ صرف اسی صورت میں کرسکتا تھا، جب اس کے پاس پانی نہ ہو۔ پانی کی موجودگی میں تیمّم کرلینا اس کے لیے جائز نہ ہوتا۔

آیۂ زیر بحث پر تدبر کی نگاہ ڈالنے سے ہمارے نزدیک یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اس میں پانی نہ ہونے کی شرط صرف عام حالات سے متعلق ہے، یعنی آدمی نے اگر رفع حاجت کی ہو یا وہ جنابت سے ہو، مگر پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمّم کر کے نماز پڑھنی ہوگی۔ مرض اور سفر کی حالت میں پانی ہونے یا نہ ہونے کو شرط کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

ہماری اس رائے کی ایک وجہ یہ ہے کہ سفر اور مرض کی حالت میں بھی اگر پانی نہ ہونے ہی کی صورت میں تیمّم کی اجازت ہوتی تو پھر ان دو صورتوں کا خاص طور پر ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس صورت میں غور کیجیے تو یہی الفاظ کافی تھے:

''مسلمانو، جب نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو۔ اگر حالت جنابت میں ہو تو غسل کرو۔ اور، ان دونوں صورتوں میں، اگر پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرو۔''

دیکھ لیجیے، ان الفاظ کے بعد یہ بات کہنے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں ہے کہ 'مرض میں اگر پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرو' یا یہ کہ 'حالت سفر میں، اگر پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرو'، اس کی وجہ یہ ہے کہ محض 'پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرو' کے الفاظ نے ان تمام حالتوں کا احاطہ کرلیا ہے۔

چنانچہ اس بات کی روشنی میں قرآن مجید کی اس آیت میں جو احکام دیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ اس طرح کیا جا سکتا ہے:

''مسلمانو، جب نماز کے لیے اٹھو تو وضو کرو۔ اگر حالت جنابت میں ہو تو غسل کرو۔ اگر تم مریض ہو یا سفر میں ہو یا تمھیں وضو یا غسل کی ضرورت ہو، مگر پانی نہ پاؤ تو تیمّم کرو۔''

ہماری اس رائے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جب اس آیت کے شروع ہی میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ نماز سے پہلے عام حالات میں وضو، اور جنابت کی حالت میں غسل کرنا ضروری ہے تو 'جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُم مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ'[3] وجوہ تیمّم نہیں، بلکہ وجہ وضو اور وجہ غسل ہیں۔ غور کیجیے تو وجہ تیمّم یہاں یہ پوری بات ہے جو 'جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُم مِّنَ الۡغَآئِطِ...' سے شروع ہو کر 'فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً'[4] پر ختم ہو رہی ہے۔ چنانچہ عربی نحو کی رو سے 'فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً' دراصل 'جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُم مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' پر تعقیب ہے۔ لہٰذا 'فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً' جب وجہ تیمّم بیان کرنے والے ایک جملے کا حصہ ہے تو تیمّم کے دوسرے دو وجوہ، یعنی حالت مرض اور حالت سفر پر اسے شرط نہیں مانا جا سکتا۔

چنانچہ ہمارے نزدیک وضو یا غسل کے بدلے میں تیمّم کر کے نماز پڑھ لینے کی یہ

---

[3] ''تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو۔''

[4] ''پھر تم پانی نہ پاؤ۔''

رخصت اللہ تعالیٰ نے تین حالتوں میں دی ہے:

ا۔ مرض کی حالت

ایک یہ کہ آدمی مریض ہو اور اس مرض کی وجہ سے اس کے لیے وضو یا غسل کرنا مشقت کا باعث ہو۔ مثال کے طور پر اس کے لیے پانی کا استعمال مضر ہو یا اس مرض کی وجہ سے وہ اتنا کمزور ہو گیا ہو کہ اس کے لیے پانی تک پہنچنا اور وضو یا غسل کرنا مشکل ہو گیا ہو۔

ب۔ سفر کی حالت

دوسرے یہ کہ مسافر کے لیے بھی وضو یا غسل کے بجاے نماز کے لیے تیمّم کرنا جائز ہے۔ اس میں ایسے مسافر بھی شامل ہوں گے جنھیں پانی تو دستیاب ہو، مگر کسی بھی اور وجہ سے ان کے لیے وضو یا غسل کرنا مشقت کا باعث بن رہا ہو۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ مرض اور سفر کی حالت میں نماز کے لیے وضو یا غسل کی جگہ تیمّم کرنا بہرحال ایک رخصت ہے۔ ہر شخص کو خود اپنے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کرنا ہے کہ اسے اس رخصت سے فائدہ اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ حتمی طور پر، نہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہر مریض اور مسافر کو وضو یا غسل کے بجاے لازماً تیمّم ہی کرنا چاہیے اور نہ یہ کہنا ہی درست ہوگا کہ ان تمام سہولتوں کی وجہ سے جو آج ہمیں میسر ہیں، کسی مریض یا مسافر کو اس رخصت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

مولانا امین احسن اصلاحی رخصت اور عزیمت کے معاملے میں صحیح نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس امر میں تو شبہ کی گنجایش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں جو رخصتیں رکھی ہیں، وہ سب اس کی مہربانی اور رحمت کا مظہر ہیں۔ وہ ہماری کمزوریوں اور ہماری مجبوریوں سے سب سے زیادہ باخبر ہے۔ اس وجہ سے، اس نے ہم پر کوئی بوجھ ایسا نہیں ڈالا ہے، جو ہماری طاقت سے زیادہ ہو۔ اس نے وضو کا حکم دیا، تو ساتھ ہی یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر سفر کی حالت ہو، پانی نہ دستیاب ہوسکتا ہو یا بیماری کے سبب سے وضو کرنے میں مضرت کا اندیشہ ہو، تو آدمی تیمّم کر سکتا ہے۔ اس نے نماز کا حکم دیا، تو ساتھ ہی یہ رخصت بھی عنایت فرمائی کہ سفر کی حالت میں آدمی قصر کرسکتا ہے۔ اسی طرح روزہ کا حکم دیا، تو یہ اجازت بھی دی کہ اگر روزے کے مہینے میں، سفر پیش آجائے یا آدمی بیمار پڑ جائے، تو دوسرے دنوں میں اپنے روزے پورے کرے۔ اس طرح کی رخصتیں، دین کے ان تمام احکام کے ساتھ مذکور ہیں، جن کی تعمیل کے کسی مرحلے میں، کوئی ایسی مشکل پیش آسکتی ہے، جو عام قوت برداشت سے زیادہ ہو۔ ان کے بارے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ آدمی، ضرورت پیش آجانے پر، ان سے فائدہ اٹھائے اور عزیمت کے جوش میں، خواہ مخواہ، اپنی جان کو مشقت میں نہ ڈالے۔ اگر کوئی شخص مضرت کے اندیشہ کے باوجود تیمّم کے بجائے وضو پر اصرار کرے یا زحمتوں کے باوجود، سفر میں، اتمام نماز ہی کو تقاضائے تقویٰ سمجھے یا مشقت کے باوجود، سفر کی حالت میں بھی، روزے

پورے کرنے ہی کو عزیمت جانے، تو ہمارے نزدیک، ایسا شخص، اسلام کا اصلی مزاج سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ دین کے معاملے میں تشدد پسندی ہے۔ اور جو شخص، دین میں تشدد پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے اور رخصتوں کو خلاف عزیمت جانتا ہے، وہ درحقیقت، دین سے دھینگا مشتی کرتا ہے۔ اور ایسا شخص، حدیث میں وارد ہے کہ دین سے شکست کھا جاتا ہے۔ چنانچہ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صاحب کو تنبیہ فرمائی، جو سفر میں روزے کی وجہ سے، اپنے آپ کو سخت مشقت میں ڈالے ہوئے تھے۔ لیکن، اگر کسی شخص کو سفر میں ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہوں، وہ بلا کسی خاص زحمت کے پوری نمازیں پڑھ سکتا ہے یا روزے رکھ سکتا ہے، تو اس سے کسی گناہ کے لازم ہونے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟'' (تدبر قرآن ۱/۴۱۹)

ج۔ پانی کی نایابی

تیسری حالت جس میں اللہ تعالیٰ نے تیمّم کر کے نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، پانی کی نایابی ہے۔ اگر کسی وقت وضو یا غسل کی ضرورت ہو، مگر پانی دستیاب نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھی جائے گی۔

قرآن مجید کے الفاظ 'جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُم مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً'[۵] سے یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں، خواہ رفع حاجت کے نتیجے میں وضو کی ضرورت ہو یا عورت سے تعلق قائم کرنے کے

۵۔ ''تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آیا ہو یا عورتوں سے ملاقات کی ہو، پھر پانی نہ پاؤ۔''

نتیجے میں[6] غسل کی، بہرحال تیمّم کر کے نماز ادا کی جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ پانی نہ ہونے کی صورت میں وضو اور غسل، دونوں کی جگہ تیمّم کیا جائے گا۔ عمران بن حصین خزاعی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

إن رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم رأى رجلاً معتزلًا لم يصل في القوم فقال: يا فلان ما منعك أن تصلي في القوم؟ فقال: يا رسول اللّٰه أصابتني جنابة ولا ماء، قال: عليك بالصعيد فإنه يكفيك.
(بخاری، رقم ۳۳۵)

''ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی اور الگ کھڑا رہا۔ آپ نے دریافت فرمایا: تم نے لوگوں کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھی؟ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ، میں جنابت سے ہوں اور (میرے پاس غسل کے لیے) پانی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: مٹی استعمال کرو۔ (اس صورت میں) تمھارے لیے یہی کافی ہے۔''

---

[6] ہمارے نزدیک قرآن مجید کے الفاظ 'لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ' سے عورت کو محض چھونا مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے میاں بیوی کا صحبت کرنا مراد ہے۔ تفصیل کے لیے 'باب الوضوٗ' کے آخر میں ''نواقض ـــ چند اختلافات'' کے زیر عنوان بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

۲۔ تیمّم کا طریقہ

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ تیمّم کی رخصت بیمار، مسافر اور ایسے شخص کے لیے ہے جسے پانی دستیاب نہ ہو، اب ہم دیکھتے ہیں کہ تیمّم کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ. (المائدہ ۵:۶)

''تو پاک مٹی دیکھ کر اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر اس سے مسح کر لو۔''

قرآن مجید کی اس آیت پر غور کیجیے تو اس معاملے میں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ 'صَعِيْدًا طَيِّبًا' سے کیا مراد ہے؟ اہل لغت کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ 'صعید' سطح زمین کو کہا جاتا ہے۔ صاحب ''لسان العرب'' اس لفظ پر اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لا أعلم بين أهل اللغة خلافًا فيه أن الصعيد وجه الأرض. (۳/۲۵۴)

''اس بارے میں، میں نے اہل لغت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا کہ 'صعید' زمین کی سطح ہی کو کہتے ہیں۔''

چونکہ سطح زمین زیادہ تر مٹی ہی پر مشتمل ہے، اس وجہ سے لفظ 'صعید' مٹی کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ ''لسان العرب'' ہی میں امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

لا يقع إسم صعيد إلا على تراب ذى غبار. (۲۵۴/۳)

''اسم 'صعید' صرف غبار والی مٹی ہی کے لیے بولا جاتا ہے۔''

ہمارے نزدیک، یہی بات صحیح ہے کہ اپنی اصل سے ترقی کر کے لفظ 'صعید' مٹی کے لیے استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق سطح زمین یا پاک مٹی سے تیمّم کیا جا سکتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی قرآن مجید کے اس حکم کا یہی منشا سمجھا تھا۔ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ ایک ایسے سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے، جس میں ان کے پاس پانی نہ تھا اور انھیں جنابت لاحق ہوگئی، کہتے ہیں:

فتمعكت، فأتينا النبى صلى الله عليه وسلم فذكرت ذلك له، فقال: إنما كان يكفيك أن تقول هكذا وضرب بيديه إلى الأرض، ثم نفخهما، ثم مسح بهما وجهه ويديه إلى نصف الذراع. (ابوداؤد، رقم ۳۲۷)

''پھر میں مٹی میں لوٹ پوٹ ہوا (اور پھر میں نے نماز پڑھ لی)۔ اس کے بعد میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تمھارے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ تم اس طرح کرتے، آپ نے زمین پر ہاتھ مارے، پھر ان میں پھونک (کر انھیں جھاڑ) لیا، پھر ان سے اپنے چہرے اور اپنے آدھے بازو (یعنی کلائی اور کہنی کے

درمیان) تک مل لیا۔''

لیکن یہ بات بھی بالبداہت واضح ہے کہ چونکہ مٹی کے ذرات، بالعموم ہر جگہ پر پائے جاتے ہیں، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں آسانی پیدا کرنے کے لیے، اس معاملے میں یہ وسعت دے دی کہ دیوار، چٹان یا پتھر، غرضیکہ کسی بھی ایسی چیز سے تیمّم کیا جاسکتا ہے جس پر گرد وغبار پڑ گیا ہو۔[1] ابوداؤد کی روایت ہے:

أقبل [النبی صلی اللّٰہ علیہ	''نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک دیوار کی
وسلم] علی الحائط فوضع	طرف بڑھے، پھر آپ نے دیوار پر
یدہ علی الحائط ثم مسح	ہاتھ مار کر اس سے اپنے چہرے اور
وجھہ ویدیہ. (رقم ۲۸۰)	ہاتھوں پر مسح کیا۔''

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

کان النبی صلی اللّٰہ علیہ	''جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی
وسلم إذا وقع بعض أھلہ	ازواج سے تعلق قائم کرتے، اور ماندگی

---

[1] جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اس طرح کی وسعت دین میں آسانی پیدا کرنے کے لیے دی جاتی ہے۔ اسی کی ایک مثال سفر میں نماز قصر کرنا ہے۔ قرآن مجید میں نماز قصر کرنے کی رخصت ایسے سفر ہی کے لیے ہے جس میں مسافر کو دشمنوں کی طرف سے حملے کا اندیشہ ہو، مگر چونکہ عام طور پر سفر میں افراتفری ہوتی ہی ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رخصت کو وسعت دیتے ہوئے اس میں عام سفر بھی شامل کر دیے۔

فکسل أن یقوم ضرب یدہ علی الحائط فتیمم.

محسوس کرتے تو دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کر لیتے تھے۔''

(اعلاء السنن ۱/ ۲۲۴)

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ 'پاک مٹی' سے مراد ایسی مٹی ہے جس کے بارے میں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ ناپاک ہے۔

قرآن مجید کی آیت تیمّم میں دوسری بات جو بیان ہوئی ہے، وہ تیمّم کا طریقہ ہے۔ غور کیجیے تو آیت کے الفاظ 'اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں پر مسح کر لو' سے بڑی آسانی سے تیمّم کا طریقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے کسی پاک جگہ پر ہاتھ مار کر دونوں ہاتھوں سے چہرے کا مسح کیا جائے گا، پھر بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ کا اور اس کے بعد دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کا مسح کیا جائے گا۔

اوپر ہم نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کی ہے، اس سے بھی تیمّم کرنے کا یہی طریقہ معلوم ہوتا ہے۔

جیسا کہ ہم 'باب الوضو' میں بھی بیان کر چکے ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو یہ آداب سکھائے ہیں کہ کام کرتے ہوئے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھی جائے اور اسے داہنی طرف ہی سے شروع کیا جائے، اس وجہ سے تیمّم کرتے ہوئے بھی 'بسم اللہ' پڑھنی چاہیے اور اس میں ہاتھوں کا مسح کرتے ہوئے اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ پہلے دائیں ہاتھ کا اور اس کے بعد بائیں ہاتھ کا مسح کیا جائے۔

فصل۲: تنبیہات

تیمّم میں ہاتھوں کا مسح کہاں تک کرنا ہوگا؟ اس میں کتنی مرتبہ مٹی پر ہاتھ مارنا ضروری ہے؟ کیا تیمّم کرتے ہوئے چہرے اور ہاتھوں پر مٹی کا لگنا ضروری ہے؟ اس طرح کے سوالات کا جواب سمجھنے سے پہلے تیمّم کے بارے میں چند ضروری باتیں جان لینی چاہییں۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، مرض، سفر یا پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کرنا بنیادی طور پر ایک رخصت ہے۔ ظاہر ہے، عام حالات میں پانی ہوتے ہوئے تیمّم سے طہارت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان تین مخصوص حالتوں میں تیمّم جسمانی طہارت حاصل کرنے کا ایک ایسا علامتی مظہر ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، اس وجہ سے غور کیجیے تو اس کا اصل مقصد اللہ کے حضور پیش ہونے کے لیے تیاری اور ایک قسم کی روحانی پاکیزگی کا احساس پیدا کرنا ہے۔

ظاہر ہے، اگر ایک شخص نے اپنی بیوی سے تعلق قائم کیا ہے تو اپنے چہرے اور ہاتھوں پر مٹی مل لینے سے اس کے جسم پر لگی ہوئی نجاست ختم نہیں ہو جائے گی، مگر ایسا کرنے سے اسے اللہ کے حضور پیش ہونے کے لیے ایک قسم کی تیاری اور شریعت کے اس حکم کی پابندی سے ایک قسم کی روحانی پاکیزگی کا احساس بہرحال پیدا ہوگا۔

چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تیمّم طہارت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ نہیں، بلکہ مرض، سفر یا پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت کے اصل ذرائع ـــــ وضو اور غسل ـــــ کا

قائم مقام اوران کی علامت ہے۔اسی بات کی وضاحت میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''...اگرچہ (تیمّم میں) یہ مسح، پاکیزگی کے حصول کے نقطۂ نظر سے، کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اصل طریقۂ طہارت کی یادداشت ذہن میں قائم رکھنے کے پہلو سے، اس کی بڑی اہمیت ہے۔شریعت نے، اکثر عبادات میں، یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ جب، اصلی صورت میں، ان کی تعمیل ناممکن یادشوار ہو، تو، شبہی صورت میں، ان کی یادگار باقی رکھی جائے، تاکہ جب حالات درست ہو جائیں، تو ان کی طرف پلٹنے کے لیے طبیعت میں آمادگی باقی رہے۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۳۰۳)

تیمّم کے بارے میں یہ حقیقت جان لینے کے بعد اب مذکورہ سوالات پر غور کیجیے تو بڑی آسانی سے ان کے جواب سمجھے جا سکتے ہیں۔

ا۔تیمّم میں ہاتھوں کا مسح کہاں تک ہے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ تیمّم میں ہاتھوں کا مسح کہاں تک کرنا چاہیے تو اس معاملے میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ عربی زبان میں لفظ 'ید' کا اطلاق پونچے، یعنی کلائی تک ہاتھ پر بھی ہوتا ہے، کہنی تک بازو پر بھی ہوتا ہے اور کندھے تک بازو پر بھی ہوتا ہے، مگر تیمّم چونکہ، اصل میں، وضو کا بدل ہے، اس وجہ سے اس معاملے میں اصل کی حیثیت جس چیز کو حاصل ہے، وہ قرآن مجید میں وضو کرتے ہوئے ہاتھ دھونے کا حکم ہی ہے۔'باب الوضوٗ' میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ وضو کرتے ہوئے ہاتھوں کو

کہنیوں تک دھونا ضروری ہے۔ چنانچہ تیمّم میں بھی ہاتھوں کا مسح زیادہ سے زیادہ کہنیوں ہی تک ضروری قرار دیا جا سکتا ہے۔ مزید براں، جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے کہ تیمّم، پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت حاصل کرنے کا علامتی مظہر ہے، اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہاتھوں کا مسح کہنیوں ہی تک کرنا لازم ہے، بلکہ اس معاملے میں لفظ 'ید' کے کم سے کم اطلاق، یعنی کلائی سے کچھ اوپر تک سے لے کر اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ اطلاق، یعنی کہنیوں تک مسح کر لینے کی گنجایش موجود ہے۔

تیمّم میں ہاتھوں کا مسح کرنے کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث میں بھی ہمیں یہ وسعت نظر آتی ہے۔ اوپر حضرت عمار بن یاسر کی جو روایت ہم نے نقل کی ہے، اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کلائی سے تھوڑا اوپر تک مسح کر کے یہ بتا دیا کہ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی حتمی حد بندی نہیں فرمائی ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

إنما كان يكفيك أن تقول هكذا وضرب بيديه إلى الأرض، ثم نفخهما، ثم مسح بهما وجهه ويديه إلى نصف الذراع. (ابوداؤد، رقم ۲۷۵)	''(آپ نے فرمایا): تمھارے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ تم اس طرح کرتے، پھر آپ نے زمین پر ہاتھ مارے، پھر ان میں پھونک (کر انھیں جھاڑ) لیا، پھر ان سے اپنے چہرے اور اپنے آدھے بازو (یعنی تقریباً کلائی اور کہنی

کے درمیان) تک مسح کیا۔''

اسی طرح بعض دوسری روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کرنے کو کہا ہے۔

۲۔ ہاتھوں اور چہرے کے لیے الگ الگ مٹی لینا

اوپر ہم نے تیمّم کی حقیقت پر اپنا جو نقطۂ نظر واضح کیا ہے، اس کے بعد یہ بات بڑی آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وضو کے برعکس، تیمّم میں اس بات کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے کہ اس میں چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے دو مرتبہ، الگ الگ، مٹی پر ہاتھ مارا جائے یا ایک ہی مرتبہ۔

اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی احادیث سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ تیمّم میں، مٹی یا دیوار پر، ایک ہی مرتبہ ہاتھ مار کر بھی چہرے اور ہاتھوں، دونوں کا مسح کیا جا سکتا ہے اور اس مقصد کے لیے ہاتھ کو مٹی پر دو مرتبہ بھی مارا جا سکتا ہے۔

جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

التيمم ضربة للوجه وضربة للذراعين إلى الموفقين. (اعلاء السنن ۲۲۱/۱)	''تیمّم میں ایک مرتبہ چہرے کا مسح کرنے کے لیے، اور ایک مرتبہ کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے

(مٹی پر) ہاتھ مارنے چاہییں۔''

ایک دوسری روایت میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

سألت النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن التیمم، فأمرنی ضربة واحدة للوجه والکفین. (ابوداؤد، رقم ۲۷۶)

''میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تیمّم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے مجھے چہرے اور ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے مٹی پر ایک ہی مرتبہ ہاتھ مارنے کا حکم دیا۔''

۳۔ اعضا پر لازماً مٹی لگنا

ہم جانتے ہیں کہ وضو اور غسل میں اعضا اس طرح سے دھونے ضروری ہیں کہ ان کا کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ یہ بات سامنے رکھتے ہوئے کسی کے ذہن میں یہ سوال بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ تیمّم میں بھی چہرے اور ہاتھوں، دونوں پر پوری طرح سے مٹی لگنی چاہیے یا نہیں؟

اس سوال کے جواب میں بھی یہ بات ذہن میں رکھیے کہ تیمّم دراصل مرض، سفر یا پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت کے اصل ذرائع ـــ وضو اور غسل ـــ کا قائم مقام، ان کی علامت اور یادگار ہے۔ چنانچہ تیمّم کی اس حیثیت کے پیش نظر، وضو اور غسل کے برعکس، تیمّم میں چہرے اور ہاتھوں پر مٹی لگنی ضروری نہیں ہے۔

حدیث کی کتابوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو عمل بیان ہوا ہے، اس سے بھی

ہماری اس رائے کی تائید ہوتی ہے۔ اوپر ہم نے عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

إنما كان يكفيك أن تقول هكذا وضرب بيديه إلى الأرض، ثم نفخهما، ثم مسح بهما وجهه ويديه إلى نصف الذراع.
(ابوداؤد، رقم ۳۲۷)

''(آپ نے فرمایا): تمھارے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ تم اس طرح کرتے، پھر آپ نے زمین پر ہاتھ مارے، پھر ان میں پھونک (کر انھیں جھاڑ) لیا، پھر ان سے اپنے چہرے اور اپنے آدھے بازو (یعنی تقریباً کلائی اور کہنی کے درمیان) تک مسح کیا۔''

اس حدیث کے بعض دوسرے طرق میں یہ بات زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ ہم یہاں ان میں سے چند روایات بھی نقل کیے دیتے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يا عمار إنما كان يكفيك هكذا ثم ضرب بيديه الأرض، ثم ضرب إحدا هما على الأخرى ثم مسح....
(ابوداؤد، رقم ۳۲۷)

''اے عمار، تمھارے لیے ایسا کرنا ہی کافی تھا، پھر آپ نے زمین پر ہاتھ مارے، پھر ایک ہاتھ کو دوسرے پر مارا (اور جھاڑ لیا)، پھر اس سے مسح کیا...۔''

اسی واقعے کو بخاری رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

إنما كان يكفيك أن تصنع	''تمھارے لیے یہی کافی ہوتا کہ تم
هكذا فضرب بكفه ضربة	اس طرح کرتے، پھر آپ نے ایک
على الأرض ثم نفضها ثم	مرتبہ زمین پر ہاتھ مارے، پھر انھیں
مسح بها.... (رقم ۳۳۴)	جھاڑا، پھر ان سے مسح کیا...''

فصل ۳: نواقض تیمّم

تیمّم کے باب میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایک تیمّم کے ساتھ ایک ہی نماز پڑھی جاسکتی ہے یا وضو کی طرح، جب تک کوئی ناقض پیش نہ آ جائے، تیمّم کے بعد بھی، ایک سے زیادہ نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں؟ ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مرض، سفر اور پانی نہ ہونے کی صورت میں شریعت نے تیمّم کو بالکل وہی حیثیت دے دی ہے جو عام حالات میں وضو یا غسل کو حاصل ہے۔ چنانچہ وضو ہی کی طرح، جب تک تیمّم ٹوٹ نہ جائے، اس کے ساتھ مسجد میں قیام کیا جاسکتا، نماز پڑھی جاسکتی، مصحف پکڑا جاسکتا اور قرآن مجید کی تلاوت کی جاسکتی ہے۔ غرض کہ وہ تمام اعمال جن کے لیے عام حالات میں، شریعت نے وضو یا غسل کو ضروری قرار دیا ہے، سفر اور مرض کی حالت میں ان کے لیے تیمّم کفایت کرتا اور پانی نہ ہونے کی صورت میں ان سے پہلے تیمّم کرنا لازم ہوتا ہے[۸]۔ اس کے بعد شریعت میں تیمّم کرنے والے کی بالکل وہی

حیثیت ہو جاتی ہے جو عام حالات میں وضو یا غسل کے بعد ہوتی ہے۔

چنانچہ تیمّم کرنے کے بعد اس وقت تک ایک ہی تیمّم سے مسجد میں قیام کیا جا سکتا یا نمازیں پڑھی جا سکتیں یا قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکتی ہے، جب تک تیمّم کرنے والے کو نواقض وضو میں سے کوئی لاحق نہ ہو جائے۔ بہ الفاظ دیگر، وہ سب چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان سے تیمّم بھی ٹوٹ جائے گا اور اس کے بعد دوبارہ تیمّم کرنا ضروری ہوگا۔[۹]

وضو کے ان نواقض کے ساتھ ساتھ، اس حالت کے ختم ہو جانے سے بھی تیمّم کی اجازت نہیں رہتی جس کے باعث تیمّم جائز ہوا تھا۔ مثال کے طور پر مریض کے لیے، مرض سے صحت یابی، مسافر کے لیے سفر سے لوٹنے اور پانی نہ ہونے کی صورت میں

---

۸ یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ سفر اور مرض کی حالت میں تیمّم بنیادی طور پر ایک رخصت ہے۔ چنانچہ، جیسا کہ ہم پہلے واضح کر چکے ہیں، اگر کوئی شخص اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کے بجاے وضو یا غسل ہی کرتا ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس، پانی نہ ہونے کی صورت میں لازماً تیمّم کر کے نماز پڑھی جائے گی۔ چنانچہ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کے بجاے پانی ملنے ہی کا انتظار کرنا اور اگر، نماز کے وقت میں، پانی نہ ملے تو وقت کے بعد نماز پڑھنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔

۹ تفصیل کے لیے دیکھیے: ''باب الوضوٗ'' میں ''نواقض وضوٗ'' کی بحث۔

پانی کے دستیاب ہو جانے کے بعد تیمّم کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور اب اس کے ساتھ نماز نہیں پڑھی جا سکتی۔ اب اپنی حالت کے لحاظ سے آدمی کو وضو یا غسل کرنا ہوگا۔[10] ہم اوپر یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ تیمّم، طہارت حاصل کرنے کا اصل ذریعہ نہیں، بلکہ مرض، سفر یا پانی نہ ہونے کی صورت میں طہارت کے اصل ذرائع ـــ وضو اور غسل ـــ کا قائم مقام اور ان کی علامت ہے۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ جونہی مرض، سفر یا پانی نہ ہونے کی حالت ختم ہو جائے گی، آدمی شریعت کے اصل حکم، یعنی وضو یا غسل ہی کا مکلّف ہو جائے گا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو تیمّم کی یہی حیثیت سمجھاتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصعيد الطيب وضوء المسلم ولو إلى عشر سنين فإذا وجدت الماء فامسه جلدك فإن ذلك خير. (ابوداؤد، رقم ۲۸۱)	''(پانی نہ ہو تو) پاک مٹی ہی مسلمان کا وضو ہے، اگرچہ دس سال تک پانی نہ ملے۔ پھر جب تمھیں پانی مل جائے تو اس سے اپنا جسم دھولو، کیونکہ، بلاشبہ بہتر تو وہی ہے۔''

[10] یہ واضح رہے کہ اگر تیمّم کر کے نماز شروع کر دی گئی ہے، اور نماز کے دوران ہی میں پانی دستیاب ہو گیا ہے تو 'لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' ''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا'' (البقرہ ۲:۲۸۶) میں دی گئی رخصت کے تحت اس صورت میں نماز توڑ کر وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، تیمّم ہی کے ساتھ نماز ادا کر لی جائے گی۔

خلاصۂ بحث

اس بحث کے خاتمے پر ہم تیمّم کے باب میں قرآن وسنت کی ہدایات کا خلاصہ پیش کیے دیتے ہیں:

۱۔ وہ تمام اعمال جن سے پہلے شریعت میں وضو یا غسل کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے، مرض اور سفر میں، اور پانی نہ ہونے کی صورت میں، وضو یا غسل کی جگہ، ان اعمال کے لیے تیمّم کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ مرض اور سفر کی حالت میں وضو اور غسل کی جگہ تیمّم کرنا ایک رخصت ہے۔ آدمی اپنے حالات کے لحاظ سے اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکتا ہے اور اگر وضو یا غسل ہی کرنا چاہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ ان دونوں حالتوں میں نماز کے لیے تیمّم کرنا جائز ہی قرار دیا جاسکتا ہے، اسے ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا۔

۳۔ پانی نہ ہونے کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ آدمی تیمّم کر کے نماز ادا کرے۔

۴۔ تیمّم کرنے کا طریقہ حسب ذیل ہے:

ا۔ تمام کاموں کی طرح تیمّم میں بھی سب سے پہلے 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' پڑھی جائے۔

ب۔ زمین، پتھر، چٹان، دیوار یا کسی بھی ایسی جگہ پر ہاتھ مار لیے جائیں جس کے

بارے میں غالب گمان یہی ہو کہ وہ ناپاک نہیں ہے۔

ج۔ ہاتھوں پر مٹی لگ جانے کی صورت میں ہاتھ جھاڑ لیے جائیں۔

د۔ ان ہاتھوں کو پہلے اپنے چہرے پر اور اس کے بعد اپنے بازوؤں پر پھیر لیا جائے۔ بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پہلے دائیں بازو پر ہاتھ پھیرا جائے اور پھر بائیں پر۔

۵۔ وہ تمام چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان سے تیمّم بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کے علاوہ سفر کی وجہ سے تیمّم کیا گیا ہے تو سفر ختم ہونے پر، مرض کی وجہ سے کیا گیا ہے تو صحت یاب ہونے پر اور اگر پانی نہ ہونے کی وجہ سے کیا گیا ہے تو پانی دستیاب ہونے پر تیمّم خود بخود ٹوٹ جائے گا، اور اب حسب ضرورت وضو یا غسل کرنا ہوگا۔

هذا ما عندی و العلم عند اللّٰه

[مارچ ۱۹۹۵ء]

باب الحیض والنفاس[1]

فصل ۱: حیض سے متعلق اسلام کا قانون

'حیض' اس خون کو کہتے ہیں جو ہر مہینے چند روز کے لیے عورتوں کو آتا ہے۔ حیض سے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ	''وہ تم سے حیض کے بارے میں
قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ	پوچھتے ہیں، کہہ دو: یہ ناپاکی ہے، اس
فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ	لیے ایام حیض میں عورتوں سے الگ
حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ	رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں،
فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ	ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب وہ
اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ	غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ،

[1] ہم ''باب الغسل'' میں واضح کر چکے ہیں کہ حیض اور نفاس کے بارے میں شریعت کے احکام یکساں ہیں۔

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ. (البقرہ۲:۲۲۲)

جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔ بے شک، اللہ بہت زیادہ توبہ کرنے والوں اور بہت زیادہ پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیۂ زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے ایام حیض کے دوران میں عورتوں سے قربت کرنے سے روکا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان دنوں میں عورتوں سے الگ رہنے کا یہ حکم اس علت پر مبنی ہے کہ یہ 'اَذًی'، یعنی ناپاکی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی کہ حیض کے ایام میں عورت کو ایک جسمانی ناپاکی لاحق ہوتی ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ بھی لازم آئے گا کہ ان دنوں میں عورتوں کو ایسے تمام کاموں سے بھی پرہیز کرنا چاہیے جن کے کرنے میں شریعت نے جسمانی طور پر پاک ہونا ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے اس حکم کی فرع بیان کرتے ہوئے ان مخصوص دنوں میں عورتوں کے لیے بعض دوسری چیزیں بھی ممنوع ٹھہرائی ہیں۔

قرآن مجید میں سنت ثابتہ کے مطابق ایک عورت کو حیض کے دنوں میں جن کاموں سے الگ رہنا چاہیے، وہ یہ ہیں:

۱۔ جنسی تعلق

قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے مطابق حیض کے دنوں میں شوہر اپنی بیوی سے زن و

شو کا تعلق قائم نہیں کر سکتا۔

قرآن مجید کے الفاظ 'لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ، فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ'[۲] سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہاں ''عورتوں سے الگ رہو'' سے مراد یہی ہے کہ ان سے زن و شو کا تعلق قائم نہ کیا جائے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس ضمن میں ہم یہاں چند روایات نقل کیے دیتے ہیں:

عن عائشة قالت: كنت أرجل رأس رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم وأنا حائض. (بخاری، رقم ۲۸۶)	''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کہتی ہیں: میں حیض کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھی۔''
إن أم سلمة قالت: حضت وأنا مع النبى صلى اللّٰه عليه وسلم فى الخميلة فانسللت فخرجت منها فأخذت ثياب	''ام سلمہ (رضی اللہ عنہا) کہتی ہیں: میں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک چادر میں لیٹے ہوئے تھے کہ مجھے حیض شروع ہو گیا۔ میں چپکے سے چادر سے نکلی اور

۲ البقرہ ۲: ۲۲۲۔ ''جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔''

حیضتی فلبستها، فقال لی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: أنفست؟ قلت: نعم، فدعانی فأدخلنی معه فی الخمیلة. (بخاری، رقم ۳۱۱)

اپنے حیض کے کپڑے پہن آئی۔ (میں لوٹی تو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا: کیا تمھیں حیض ہو گیا ہے؟ میں نے کہا: ہاں، آپ نے مجھے بلایا اور اپنے ساتھ پھر چادر میں لٹا لیا۔''

عن میمونة قالت: کان النبی صلی اللّٰه علیه وسلم یباشر نساءه فوق الأزار وهن حیض. (مسلم، رقم ۴۴۲)

''حضرت میمونہ (رضی اللہ عنہا) کہتی ہیں: جب ازواج مطہرات میں سے کوئی حیض سے ہوتیں تو آپ ازار کے اوپر اوپر سے ان سے پیار کر لیا کرتے تھے۔''

عن عائشة قالت: کنت أشرب وأنا حائض ثم أناوله النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فیضع فاه علی موضع فی فیشرب. (مسلم، رقم ۴۵۳)

''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے: میں حیض کی حالت میں پانی پیتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پانی کا برتن لے کر وہیں سے پانی پی لیتے، جہاں سے میں نے پیا ہوتا۔''

ان روایات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عام طریقہ یہی تھا کہ آپ ازواج مطہرات کے ایام حیض میں، ان کے ساتھ زن وشو کے تعلق کے

علاوہ، روزمرہ زندگی کے باقی تعلقات کو برقرار رکھتے تھے۔ ایک طرف اللہ کے پیغمبر کا یہ رویہ ہے اور دوسری طرف ہمارے معاشرے میں یہ صورت حال بھی رہی ہے کہ حائضہ عورت کے کسی چیز کے چھونے تک کو پاکیزگی کے خلاف تصور کیا جاتا تھا۔ بعض گھروں میں حائضہ عورتوں کے باورچی خانے میں داخلے پر بھی پابندی لگا دی جاتی اور ان کے برتنوں، کپڑوں اور بستروں کو بالکل الگ کر دیا جاتا تھا۔ غرضیکہ، ان مخصوص دنوں میں عورت کو انسان کے بجائے ایک اچھوت مخلوق بنا دیا جاتا۔ خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر پاکیزہ اور پاکیزگی کو پسند کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ مگر طہارت اور پاکیزگی کے باب میں آپ نے جو حدود متعین کیے اور جو رویہ اختیار فرمایا، اس پر جس پہلو سے بھی غور کر کے دیکھیے، انسان پکار اٹھتا ہے کہ یہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے یکسر پاک ہے۔ آپ کی زندگی میں ہمیں جو اعتدال نظر آتا ہے، وہی فطرت کا تقاضا اور دین میں مطلوب رویہ ہے۔ اگر کوئی شخص ان معاملات میں آپ کے طے کردہ معیارات سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے معنی یقیناً یہی ہوں گے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے پیغمبر سے زیادہ پاکیزہ سمجھتا ہے۔ نعوذ باللّٰہ من ذلك

قربت سے اجتناب کی مدت

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، حیض کے دوران میں شوہر اپنی بیوی کے ساتھ زن و شو کا تعلق قائم نہیں کر سکتا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ممانعت کب تک رہے گی؟ کیا حیض ختم ہونے کے فوراً بعد یہ تعلق قائم کیا جا سکتا ہے یا اس کے لیے عورت کے

غسل تک انتظار کرنا لازم ہے؟

قرآن مجید کے ارشاد: 'فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ، وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ'[۳] سے ہمارے نزدیک یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ممانعت 'حَتّٰی یَطْهُرْنَ' (جب تک انھیں خون آنا بند نہ ہو جائے) تک ہی ہے۔ البتہ 'فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ' (پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بہتر یہی ہے کہ عورت کے غسل کر لینے کے بعد ہی یہ تعلق قائم کیا جائے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ عورت سے قربت کی ممانعت کی اصل علت چونکہ خون ہے، اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اٹھ جاتی ہے، لیکن بہتر یہی ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے، تب اس سے ملاقات کی جائے۔

غور کیجیے تو اس سے اسلامی شریعت کا یہ مزاج بھی سامنے آتا ہے کہ اس میں انسانوں کی نفسیات اور ان کی طبیعتوں کے اختلاف کا کس شان سے خیال رکھا گیا ہے۔ مذکورہ مسئلے میں یہ بات تو قطعی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پسند یہی ہے کہ

۳۔ البقرہ ۲: ۲۲۲۔ ''ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو۔ پھر جب وہ غسل کر لیں تو ان کے پاس جاؤ، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے۔''

شوہر بیوی کے حیض کا غسل کر لینے کے بعد ہی اس سے تعلق قائم کرے، لیکن اس بات کو اگر حتمی قانون بنا دیا جاتا تو اسے نبھانے میں لوگوں کو بعض اوقات بڑی دشواری کا سامنا ہو سکتا تھا، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا تقاضا یہی ہوا کہ انسان کی کمزوریوں کا خیال رکھتے ہوئے زن وشو کے تعلق کی ممانعت کو کم سے کم وقت تک محدود رکھا جائے۔ چنانچہ یہ تو لازم قرار دیا گیا کہ ایام حیض میں زن وشو کا تعلق قائم نہ کیا جائے، مگر ساتھ ہی یہ بیان کر دیا کہ حیض ختم ہونے کے ساتھ یہ ممانعت تو ختم ہو جاتی ہے، تاہم ہمارے پروردگار کو یہ بات زیادہ پسند ہے کہ عورت کے غسل کر لینے کے بعد ہی یہ تعلق قائم کیا جائے۔

۲۔ نماز اور روزہ

نماز بندے کی اپنے رب کے حضور حاضری ہے۔ نماز کے لیے ناگزیر ہے کہ ہم اپنے آپ کو پاک صاف کر کے اللہ کے حضور میں دست بستہ کھڑے ہوں۔ حیض کے دنوں میں، چونکہ عورتوں کو ایسی علت لاحق ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ پاک نہیں رہتیں، اس لیے انھیں ان دنوں میں نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ اس معاملے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی مروجہ سنت بھی یہی ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں صحابۂ کرام، فقہا اور تابعین میں سے کسی کی رائے بھی اس کے برعکس نہیں ہے۔

نماز ہی کی طرح رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنت بھی قائم فرمائی ہے کہ حیض کے ایام میں عورتوں کو روزے بھی نہیں رکھنے چاہییں۔ چنانچہ اس معاملے میں

بھی اسلاف میں کوئی اختلاف نقل نہیں ہوا ہے۔

البتہ، یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیض کی وجہ سے چھوٹنے والی نمازوں اور روزوں کی قضا ادا کرنی ضروری ہے یا نہیں؟

اس سوال کا جواب بھی ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ملتا ہے۔ اس معاملے میں آپ نے مسلمان عورتوں کو یہ تعلیم دی کہ انھیں حیض کے دنوں میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا ادا نہیں کرنی، جبکہ ان دنوں میں چھوٹنے والے روزے ایام حیض کے بعد کسی وقت پورے کرنے ہوں گے۔

روایات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو حیض کی وجہ سے چھوٹنے والے روزے پورے کرنے کا حکم دیا، مگر ایام حیض میں قضا ہونے والی نمازیں پوری کرنے کو نہیں کہا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا: 'کیا وجہ ہے کہ حیض کے بعد، عورتیں قضا روزے تو رکھتی ہیں، مگر قضا نمازیں نہیں پڑھتیں؟' حضرت عائشہ نے جواب میں فرمایا:

کان یصیبنا ذلك فنومر بقضاء الصوم ولا نومر بقضاء الصلوٰة. (مسلم، رقم ۵۰۸)	''(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں) ہمیں حیض ہوا ہی کرتا تھا، پھر ہمیں روزے پورے کرنے کا حکم تو دیا گیا، مگر نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں دیا گیا۔''

یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ شریعت نے حیض میں چھوٹنے والے روزوں کو پورا کرنا ضروری قرار دیا ہے، مگر نماز کے معاملے میں رخصت دے دی ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ شریعت میں سب سے زیادہ اہمیت جس عبادت کو حاصل ہے، وہ نماز ہی ہے۔ صحت ہو یا بیماری، سفر ہو یا حضر، کسی حال میں نماز چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ نماز کی اس اہمیت کے پیش نظر یہ بات اور بھی زیادہ عجیب لگتی ہے کہ ایام حیض میں روزوں کے برخلاف قضا نمازیں پوری کرنے کا حکم نہیں دیا۔

ہم یہاں اس حکم کی حکمت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

پہلے نماز کا معاملہ لیجیے۔ ہم جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر دن کی پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ حیض کوئی ایسی علت نہیں ہے جو کسی عورت کو ناگہانی طور پر لاحق ہوتی ہو، بلکہ ہر مہینے کے مخصوص ایام میں اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اگر ایام حیض میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا ادا کرنی ضروری قرار دے دی جاتی تو، بے شک عورتوں کے لیے اسے نبھانا ایک مشکل کام ہوتا اور خداے رحمان ورحیم کی رحمت سے بعید ہے کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی ایسا بوجھ ڈال دے جسے اٹھانا ان کے بس میں نہ ہو۔ لہٰذا قرآن مجید میں بیان کردہ ضابطے 'لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا' کے تحت ایام حیض میں چھوٹنے والی نمازوں کی قضا

نہیں ہوتی۔

روزوں کے معاملے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ روزے صرف ماہ رمضان ہی کے فرض ہیں، نماز کی طرح یہ کوئی روزمرہ کی عبادت نہیں ہیں۔ چنانچہ کسی حائضہ کے لیے روزوں کی قضا ادا کرنے میں وہ مسئلہ پیدا نہیں ہوتا جو نماز کی قضا کے معاملے میں ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ دوسری اور اہم ترین بات یہ ہے کہ روزوں کے باب میں اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے:

وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ. (البقرہ۲:۱۸۵)

''اور (تم میں سے) جو (رمضان کے مہینے میں) بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی گنتی پوری کر لے۔''

اور اس معاملے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ حیض بھی ایک قسم کی علت یا مرض ہی ہے جو عورتوں کو لاحق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں عورتوں کو مریضوں پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں حیض کی وجہ سے چھوٹنے والے روزے رمضان کے بعد کسی وقت پورے کرنے چاہییں۔

۴؎ الانعام ۶: ۱۵۲۔ ''ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے''۔ دین کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے، خود قرآن ہی کی رو سے اس استثنا کے ساتھ مشروط ہیں۔

۳۔ مسجد میں جانا

مسجد اللہ تعالیٰ کی عبادت کا گھر اور مسلمانوں کی دینی اور سیاسی اجتماع گاہ ہے۔ چنانچہ مسجد کے تقدس کا تقاضا ہے کہ وہاں جاتے وقت ہمیشہ پاکیزگی اور صفائی کا اہتمام رکھا جائے، اس وجہ سے جس طرح کسی جنبی کے لیے بغیر کسی مجبوری کے مسجد میں جانے کی ممانعت ہے، اسی طرح حیض کی حالت میں بھی اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو کسی عورت کو مسجد میں نہیں جانا چاہیے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا. (النساء۴:۴۳)	''اے ایمان والو، نشے کی حالت میں نماز کے قریب بھی نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم جانو کہ کیا کہہ رہے ہو اور نہ جنابت کی حالت میں، مگر یہ کہ صرف گزر جانا پیش نظر ہو، یہاں تک کہ غسل کر لو۔''

قرآن مجید کی اس آیت میں اگرچہ صرف جنبی ہی کے مسجد میں داخل ہونے پر پابندی لگائی گئی ہے، لیکن بالبداہت واضح ہے کہ اس پابندی کی وجہ جنابت کی حالت میں جسم کا ناپاک ہونا ہے۔ چنانچہ جب حیض میں بھی جنابت کی طرح عورت پاک نہیں رہتی اور جنابت ہی کی طرح شریعت نے اس پر غسل کرنا لازم ٹھہرایا ہے تو

لازماً یہی پابندی حائضہ پر بھی عائد ہو جائے گی۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد کی روایت ہے:

عائشة رضی اللّٰہ عنها تقول: جاء رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ووجوه بیوت اصحابه شارعة فی المسجد، فقال: وجهوا هذه البیوت عن المسجد، ثم دخل النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم ولم یصنع القوم شیئًا رجاء أن تنزل فیهم رخصة، فخرج إلیهم بعد فقال: وجهوا هذه البیوت عن المسجد، فإنی لا أحل المسجد لحائض ولا جنب. (رقم ۲۰۱)	''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے گھروں کے دروازے مسجد میں کھلتے دیکھے تو فرمایا: اپنے گھروں کے دروازے مسجد سے پھیر لو۔ لوگوں نے اس امید میں اس حکم کی تعمیل میں تاخیر کی کہ شاید اس میں انھیں کوئی رخصت دے دی جائے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ انھیں حکم دیا: اپنے گھروں کے یہ دروازے مسجد سے پھیر لو، کیونکہ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ کوئی حائضہ یا جنبی مسجد میں داخل ہو۔''

سورۂ نساء کی مذکورہ آیت کے آخر میں 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ'[۵] کہہ کر جس طرح

اللہ تعالیٰ نے جنبی کو یہ رخصت دے دی ہے کہ بحالت مجبوری وہ مسجد سے گزر سکتا ہے، اسی طرح حائضہ کو بھی یہ رخصت حاصل ہوگی کہ وہ مجبوری کی حالت میں مسجد سے گزر سکتی ہے۔

جب کسی حائضہ کے لیے عام حالات میں مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ بات نکلتی ہے کہ کوئی حائضہ بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتی اور نہ مسجد کے اندر اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہے۔

اگر حج کے دوران میں عورت کو حیض ہو جائے تو اسے چاہیے کہ وہ بیت اللہ کے طواف کے علاوہ باقی تمام مناسک دوسرے حاجیوں کی طرح پورے کر لے۔ بخاری کی روایت ہے:

عائشة تقول: خرجنا لا نرى إلا الحج ، فلما كنا بسرف حضت، فدخل على النبى صلى اللّٰه عليه و سلم و أنا أبكى، قال: مالك، أنفست؟ قلت: نعم، قال: إن هذا أمر كتبه اللّٰه على بنات آدم،	''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں: ہم لوگ حج کے ارادے سے مدینہ سے چلے، جب ہم سرف کے مقام پر پہنچے تو مجھے حیض ہو گیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو میں رو رہی تھی۔ آپ نے فرمایا: کیا ہوا، کیا حیض ہو گیا ہے؟ میں نے

۵ ''مگر یہ کہ صرف گزر جانا پیش نظر ہو۔''

فاقضی ما یقضی الحاج غیر أن لا تطوفی بالبیت. (رقم ۲۸۵)

اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، یہ آدم کی بیٹیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ ہی کا فیصلہ ہے۔ تم طواف کے علاوہ باقی تمام مناسک حاجیوں کے ساتھ ادا کرلو۔''

۴۔قرآن مجید کو چھونا یا اس کی تلاوت کرنا

جس طرح مسجد کے تقدس کا یہ تقاضا ہے کہ جنابت یا حیض کی حالت میں اس میں داخل نہ ہوا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کے تقدس کا بھی یہ تقاضا ہے کہ ایسی حالت میں اسے پڑھا یا چھوا نہ جائے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یقرء القرآن الجنب و لا الحائض. (ابن ماجہ، رقم ۵۸۸)

''جنبی اور حائضہ قرآن نہ پڑھیں۔''

اسی طرح آپ کا ارشاد ہے:

لا یمس القرآن إلا طاهر. (فقہ السنہ ۱/۴۹)

''قرآن مجید کو صرف وہی چھوئے جو پاک ہو۔''

جس طرح قرآن مجید نے مسجد میں داخل ہونے کی ممانعت کے بعد 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' کے الفاظ سے مجبوری کی حالت میں اس ممانعت کو ایک حد تک مستثنیٰ کر دیا ہے،

اسی طرح مجبوری کی حالت میں قرآن کو چھونے یا اسے پڑھنے کے معاملے میں بھی ایک حد تک استثنا دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی عورت حیض کی حالت میں قرآن مجید کی کوئی دعا پڑھتی یا کوئی مسئلہ بیان کرنے کے لیے اس کی آیات سے استشہاد کرتی ہے تو ہمارے نزدیک یہ بات بھی 'اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ' میں دی گئی رخصت کے تحت جائز ہوگی۔

فصل ۲۔ تنبیہات

اوپر ہم نے تفصیل سے عورتوں پر ایام حیض میں جاری ہونے والے احکام بیان کر دیے ہیں۔ اب اس فصل میں ہم حیض سے متعلق چند ضمنی مسائل پر اپنا نقطۂ نظر بیان کریں گے۔

۱۔ غسل میں عجلت نہ کرنا

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق ایام حیض میں عورتوں پر عبادات اور جنسی تعلق کے معاملے میں پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ ان پابندیوں کے ہوتے ہوئے، اس بات کا امکان موجود ہے کہ کوئی عورت کسی بھی وجہ سے جلد سے جلد طہارت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور یہ خیال کرتے ہوئے کہ وہ پاک ہو گئی ہے، وقت سے پہلے ہی طہارت کا غسل کر لے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ عورتوں کو اسی وقت غسل حیض کرنا چاہیے، جب انھیں حیض کا خون آنا بالکل بند ہو گیا

ہو۔ کسی بھی وجہ سے اس سے پہلے یہ غسل نہیں کرنا چاہیے، ورنہ اس کے نتیجے میں پوری طرح سے طہارت حاصل نہیں ہوگی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی ''صحیح'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی اس معاملے میں عورتوں کو یہی ہدایت دی:

كن نساء يبعثن إلى عائشة بالدرجة فيها الكرسف فيه الصفرة فتقول: لا تعجلن حتى ترين القصة البيضاء. (كتاب الحيض، باب إقبال المحيض وإدباره)	''کچھ عورتیں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس تھیلیوں میں روئی ڈال کر بھیجا کرتیں جن پر حیض کے خون کی کچھ زردی لگی ہوتی۔ اس پر حضرت عائشہ فرماتیں کہ ابھی غسل کرنے میں جلدی نہ کرو (اس وقت تک انتظار کر لو) جب تک روئی کے یہ ٹکڑے بالکل سفید نہ ہو جائیں۔''

۲۔ استحاضہ

'استحاضہ' ایک قسم کی بیماری ہے۔ استحاضہ میں عورت کو ایام حیض کے علاوہ بھی خون آتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب قرآن مجید نے حیض کو ناپاکی قرار دیا ہے تو یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ چونکہ استحاضہ میں بھی عورتوں کو خون آتا ہے، اس وجہ سے اس کا حکم بھی شاید وہی ہوگا جو حیض کا ہے، یعنی ایک مستحاضہ کے لیے بھی وہ سب کچھ ممنوع ہوگا جس

سے حائضہ کو روکا گیا ہے۔

اس معاملے میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں جس چیز کو ناپاکی قرار دیا گیا ہے، وہ حیض ہی ہے۔ مزید براں یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ حیض اور استحاضہ ایک ہی چیز نہیں ہیں، ان کے الگ الگ نام خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ طبی لحاظ سے بھی ان میں فرق ہے۔ چنانچہ وہ ناپاکی جس کے بارے میں قرآن مجید نے 'هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ'[6] کا حکم دیا ہے، وہ حیض ہی ہے۔ لہٰذا اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ایک مستحاضہ کے لیے بھی وہ سب کچھ ممنوع مانا جائے جسے قرآن مجید نے ایک حائضہ کے لیے ممنوع ٹھہرایا ہے۔

اس معاملے میں دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ مستحاضہ حائضہ کے حکم میں نہیں ہوتی، مگر چونکہ اسے بے وقت خون آتا رہتا ہے، اس وجہ سے اس کا وضو قائم نہیں رہ سکتا، تو کیا اس کو عبادات ترک کر دینی چاہییں؟ اس مسئلے کا جواب وہی ہے جس کی طرف اس سے پہلے ''باب الوضوٗ'' میں ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے لکھا ہے:

اگر کسی شخص کو ایسی بیماری ہو جس کی وجہ سے سبیلین[7] سے کوئی چیز خارج ہوتی رہتی

---

[6] البقرہ ۲: ۲۲۲۔ ''یہ ناپاکی ہے، اس لیے ایام حیض میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں، ان سے قربت نہ کرو۔''

[7] یعنی پیشاب اور پاخانے کی جگہ۔

ہوتو اس صورت میں اس کو ہر نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر نماز کے دوران میں اس کو یہ چیز خارج ہوتی محسوس ہوتو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس رخصت کی اساس قرآن مجید ہی میں موجود ہے۔ قرآن مجید کے سارے احکام، خواہ وہ معاملات سے متعلق ہوں یا عبادات سے، خود قرآن ہی کی رو سے ایک استثنا کے ساتھ مشروط ہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا. (البقرہ ۲:۲۳۳)

''کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر کسی چیز کا مکلّف نہیں ٹھہرایا جاتا۔''

اسی طرح وضو، غسل اور تیمّم کے حکم کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ. (المائدہ ۵:۶)

''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تمھارے لیے کوئی تنگی پیدا کرے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمت تمام کرے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو۔''

چنانچہ اس اصول پر ہمارے نزدیک مستحاضہ، سلسل البول کے مریض[۸] اور ایسے شخص کو جس کی ہوا خارج ہوتی رہتی ہو، ہر نماز سے پہلے وضو کر لینا چاہیے۔ اس کے بعد اگر

۸۔ جس کا پیشاب نہ رکتا ہو اور پیشاب کے قطرے نکلتے رہتے ہوں۔

نماز کے دوران میں اس کو اپنی علت کے مطابق سبیلین سے کوئی چیز خارج ہوتی محسوس ہوتو اس کو وضو اور نماز دہرانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ بخاری کی روایت ہے:

عن عائشة قالت: إعتكفت مع النبي صلى الله عليه وسلم إمرأة من أزواجه فكانت ترى الدم والصفرة، والطست تحتها وهي تصلي. (رقم ۲۹۹)

''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے ایک آپ کے ساتھ اعتکاف میں بیٹھیں۔ انھیں استحاضہ کا خون آیا کرتا تھا۔ چنانچہ نماز پڑھتے ہوئے وہ اپنے نیچے ایک برتن رکھ لیا کرتی تھیں۔''

اس قسم کی بیماری میں یہ رخصت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابن ماجہ کی روایت ہے:

عن عائشة قالت: جاء ت فاطمة بنت أبي حبيش إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: إني إمرأة أستحاض فلا أطهر أفأدع الصلوٰة؟ فقال لها: لا، إجتنبي الصلوٰة أيام محيضك. ثم اغتسلي و

''حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کہتی ہیں: فاطمہ بنت ابی حبیش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور انھیں بتایا کہ مجھے استحاضہ ہے اور میں پاک نہیں رہتی، کیا اس وجہ سے مجھے نماز چھوڑ دینی چاہیے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، حیض کے دنوں میں نماز چھوڑ

توضئی لکل صلوۃ ثم صلی وإن قطر الدم علی الحصیر. (نیل الاوطار ۱/۳۲۳)

دو، پھر غسل کر کے ہر نماز سے پہلے وضو کرلو اور پوری نمازیں پڑھو، خواہ چٹائی (یعنی جائے نماز) پر خون ہی کیوں نہ ٹپکتا رہے۔''

مستحاضہ کے لیے حیض کی تعیین

شریعت نے جن کاموں سے حائضہ کو الگ رہنے کا حکم دیا ہے، ظاہر ہے کہ وہ سب ایک مستحاضہ پر بھی اس کے ایام حیض میں ممنوع ہیں۔ ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ استحاضہ میں عورت کو وقت بے وقت خون آتا رہتا ہے۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک مستحاضہ اپنے ایام حیض کی تعیین کس طرح کرے گی؟

عام طور پر ایک مستحاضہ خون کی رنگت اور کثافت کے ذریعے سے حیض اور استحاضہ میں فرق کر سکتی ہے۔ حیض کا خون زیادہ گہرے رنگ کا اور گاڑھا ہوتا ہے، جبکہ استحاضہ کا خون زردی مائل اور پتلا ہوتا ہے۔ چنانچہ مستحاضہ کو چاہیے کہ وہ خون کی رنگت کے لحاظ سے حیض اور استحاضہ میں فرق کر کے حیض کے دنوں میں اس سے متعلق شریعت کے احکام کی پابندی کرے۔ اس کے بعد جب خون کی رنگت اور کثافت میں کمی ہو جائے تو اسے چاہیے کہ غسل کر کے پاک ہو جائے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ ابوداؤد رحمہ اللہ کی روایت ہے:

عن فاطمة بنت أبی حبیش أنها کانت تستحاض فقال لها النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم: إذا کان دم الحیضة فإنه أسود یعرف، فإذا کان ذلك فأمسکی عن الصلوٰة، وإذا کان الآخر فتوضئی وصلی فإنما هو عرق.

(ابوداؤد، رقم ۲۴۷)

''فاطمہ بنت ابی حبیش (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ جب انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مستحاضہ ہونے کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: حیض کا خون تو سیاہی مائل ہوتا ہے اور پہچانا جاتا ہے، ایسا ہو تو نماز چھوڑ دو، پھر جب اس کی رنگت بدل جائے تو وضو کر کے نماز پڑھ لیا کرو۔ یہ حیض نہیں، یہ تو ایک رگ (کا خون) ہے (جو بہ نکلتی ہے)۔''

مگر یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ عورتوں کے لیے خون کی رنگت کے لحاظ سے حیض اور استحاضہ میں فرق کرنا مشکل ہو جائے، ایسی عورتوں کو چاہیے کہ استحاضہ کی بیماری ہونے سے پہلے، انھیں مہینے کے جن دنوں میں حیض آتا تھا، انھی مخصوص دنوں کو وہ آیندہ کے لیے بھی اپنے حیض کے دن شمار کر لیں اور ان دنوں میں ان تمام احکام کی پابندی کریں جو شریعت نے حائضہ پر عائد کیے ہیں۔

یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایت سے بھی معلوم ہوتی ہے۔ امام مالک کی موطا میں روایت ہے:

عن أم سلمة زوج النبی صلی اللّٰه علیه و سلم أن امرأة كانت تهراق الدماء فی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فاستفتت لها أم سلمة رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم فقال: لتنظر إلی عدد اللیالی و الأیام التی كانت تحیضهن من الشهر قبل أن یصیبها الذی أصابها، فلتترك الصلوة قدر ذلك من الشهر فإذا خلفت ذلك فلتغتسل، ثم لتستثفر بثوب، ثم لتصلی. (رقم ۱۲۳)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ ام المومنین حضرت ام سلمہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ ایک عورت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بہت خون آتا تھا۔ حضرت ام سلمہ نے اس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا: وہ غور کرے کہ اس طرح (یعنی استحاضہ) ہونے سے پہلے، ہر ماہ کتنے دن اسے حیض آتا تھا۔ پھر وہ ہر مہینے کے اتنے ہی دن (حیض شمار کر کے) نماز سے الگ رہے۔ پھر جب وہ دن گزر جائیں تو غسل حیض کر لے اور کوئی کپڑا باندھ کر نماز پڑھ لیا کرے۔''

[۱۹۹۴ء]

کتاب الطلاق

طلاق کے معنی

نکاح ایک مرد وعورت کے درمیان میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بھر ساتھ رہنے کا معاہدہ ہے۔ اگر یہ تعلق قائم ہونے کے بعد معلوم ہو کہ ان دونوں کے لیے کسی بھی وجہ سے اکٹھے رہنا ممکن نہیں تو اس صورت میں ان کی علیحدگی کے لیے بھی ایک مستقل قانون بنا دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جو ضابطہ قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے، اسے ''قانون طلاق'' کہتے ہیں۔ ''طلاق'' عربی زبان کی ایک اصطلاح ہے جو میاں اور بیوی کی مستقل علیحدگی کے لیے بولی جاتی ہے۔

قرآن مجید میں بڑی تفصیل کے ساتھ طلاق کا یہ قانون بیان ہوا ہے۔ اس قانون کی مختلف دفعات ایک ترتیب کے ساتھ ہم یہاں زیر بحث لائیں گے۔ اس کے بعد اس قانون کی خلاف ورزی کی صورتوں اور ان کے احکام پر بحث کریں گے۔

فصل ۱: عدت

''عدت'' کے لفظی معنی تعداد کے ہیں۔ ایک اصطلاح کے طور پر یہ لفظ ان متعین دنوں کے لیے بولا جاتا ہے جن میں طلاق کے بعد شوہر اور بیوی پر شریعت نے چند مخصوص احکام جاری کیے ہیں[1]۔

اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید میں طلاق کا جو قانون بیان ہوا ہے، اس میں ''عدت'' کو ایک نوعیت کی بنیادی اہمیت حاصل ہے تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔ اس بات کے پیش نظر ہم ''قانون طلاق'' پر اپنی اس بحث کا آغاز اسی اصطلاح کی وضاحت سے کرتے ہیں۔

۱۔ عرصۂ عدت

قرآن مجید میں سورۂ بقرہ اور سورۂ طلاق میں عورتوں کے مختلف حالات کے لحاظ سے ان کی عدت بیان ہوئی ہے۔ ہم یہاں اختصار کے ساتھ یہ احکام نقل کیے دیتے ہیں:

۱۔ عام عورتوں کی عدت

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] یہ تمام احکام آگے تفصیل سے زیر بحث آئیں گے۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ. (۲:۲۲۸) ''مطلقہ عورتیں تین قروء تک اپنے آپ کو روکے رکھیں گی۔''

اس آیت کے مطابق طلاق کے بعد ایک عورت کو تین قروء تک انتظار کرنا ہوگا۔ اس آیت کے سیاق سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں ایسی عورتوں کا حکم بیان ہوا ہے جو مدخولہ[۲] ہوں اور جن کو حیض آتا ہو۔ اس بات کی تائید قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے بھی ہوتی ہے۔

لفظ 'قرء' کے معنی متعین کرنے میں اہل لغت اور فقہا میں اختلاف ہے۔ 'قروء'، 'قرء' کی جمع ہے۔ عربی زبان میں 'قرء' حیض اور طہر[۳]، دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اس لفظ کے بارے میں اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...اس کے اصل مادہ اور اس کے مشتقات پر ہم نے جس قدر غور کیا ہے اس سے ہمارا رجحان اسی بات کی طرف ہے کہ اس کے اصل معنی تو حیض ہی کے ہیں لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ طہر بھی لازماً لگا ہوا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں، جس طرح رات کے لفظ سے اس کے ساتھ

---

۲ 'مدخولہ' سے مراد ایسی عورتیں ہیں جن کے شوہران کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم کر چکے ہیں۔

۳ وہ دن جن میں عورت کو حیض نہ آ رہا ہو۔

لگے ہوئے دن کو یا دن کے لفظ سے اس کے ساتھ لگی ہوئی رات کو۔ اس قسم کے استعمال کی مثالیں ہر زبان میں مل سکتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۳۲)

ہمارے نزدیک قرآن مجید میں لفظ 'قرء' حیض کے معنی میں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عدت کے اس حکم کی اصل علت استبرائے رحم ہے اور یہ حیض سے ہوتا ہے نہ کہ طہر سے۔ مزید یہ کہ یہاں پر چونکہ اصل مسئلہ تعیین مدت کا ہے، اس وجہ سے یہاں حیض ہی مراد ہونا چاہیے، کیونکہ حیض کا آغاز تو بالکل متعین ہوتا ہے، جبکہ اس کے ختم ہونے میں کچھ دن کا فرق پڑ سکتا ہے۔

ب۔ غیر مدخولہ عورتوں کی عدت

سورۂ احزاب میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا. (۴۹:۳۳)

''اے ایمان والو، جب تم مومنہ عورتوں سے نکاح کرو، پھر انھیں ہاتھ لگانے سے پہلے ہی طلاق دے دو تو ان کے بارے میں تم پر کوئی عدت واجب نہیں ہے، جس کا تمھیں لحاظ کرنا ہو۔''

ایسی عورتیں جنھیں مباشرت سے پہلے ہی طلاق ہو جائے، ان کی کوئی عدت نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ عدت گزارنے کی اصل حکمت، جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں،

استبرائے رحم ہے اور غیر مدخولہ عورتوں کے بارے میں ظاہر ہے کہ حمل ٹھہرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ج۔ ایسی عورتوں کی عدت جنھیں حیض آنا بند ہو گیا ہو یا حیض نہ آتا ہو

سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ. (۶۵:۴)

''اور تمھاری وہ عورتیں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں، اگر ان کے (حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کے) باب میں تمھیں شک ہو تو ان کی عدت تین (قمری) مہینے ہے اور اسی طرح ان کی بھی جنھیں حیض نہ آیا ہو۔''

آیسہ، یعنی وہ عورتیں جنھیں حیض آنا بند ہو گیا ہو، ان کی عدت تین ماہ ہو گی۔ یہ قانون ایسی آیسہ عورتوں کے بارے میں ہے جن کے ساتھ ان کے شوہروں نے کچھ ہی عرصہ پہلے زن وشو کا تعلق قائم کیا ہو اور اس وجہ سے ان کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے میں شبہ ہو تو ان کی عدت تین ماہ ہو گی۔ اس سے آپ سے آپ یہ حکم بھی نکلتا ہے کہ اگر ایک عرصے سے مرد و عورت کے درمیان زن وشو کا تعلق قائم نہ ہوا ہو اور بیوی کے حاملہ ہونے کا کوئی شبہ نہ ہو تو ایسی آیسہ کے لیے عدت گزارنے کی کوئی قید نہیں ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ آیسہ کی عدت تین ماہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے حیض کے حساب سے عدت کا تعین ممکن نہیں، اس وجہ سے حکم میں اشتراک علت کے باعث ایسی عورتوں کے لیے جو ابھی حیض کی عمر کو نہیں پہنچیں اور مستحاضہ خواتین[۴] کے لیے بھی عدت تین ماہ ہی ہوگی۔

اسی طرح ان عورتوں کی عدت بھی تین ماہ رکھی گئی ہے جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہ آیا ہو[۵]۔

د۔ حاملہ خواتین کی عدت

اگر کسی حاملہ کو طلاق دی جائے یا عدت کے دوران میں یہ معلوم ہو جائے کہ مطلقہ حاملہ ہے تو اس صورت میں اس کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

۴؎ یعنی ایسی عورتیں جنھیں خاص ایام کے علاوہ بھی خون آتا ہو۔

۵؎ مفسرین اور فقہا نے 'وَالّٰئِیْ لَمْ یَحِضْنَ' (وہ جنھیں حیض نہیں آیا) سے ایسی بچیاں مراد لی ہیں جن کو ابھی حیض آنا شروع نہیں ہوا۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اگر یہ بات بتانی پیش نظر ہوتی تو غالباً کچھ اس طرح کے الفاظ ہوتے: 'والّلاتی ما حضن' یعنی ایسی عورتیں جن کو ابھی حیض نہیں آیا۔ عربی زبان میں 'لم' نفی جحد کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اس سے مراد وہ عورتیں ہوں گی جنھیں حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود حیض نہیں آیا۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ. ''اور حمل والیوں کی مدت وضع حمل ہے۔''

(الطلاق ۶۵:۴)

۲۔ عدت کے احکام

عدت کی مدت کا تعین ہو جانے کے بعد، اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عرصے کے دوران میں اللہ تعالیٰ نے شوہر اور بیوی کے لیے کیا احکام دیے ہیں۔ یہ احکام قرآن مجید کی سورۂ بقرہ اور سورۂ طلاق میں بیان ہوئے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ

''اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں گی اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اسے چھپائیں۔ اور اس دوران میں ان کے شوہر انھیں لوٹا لینے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ سازگاری کے

دَرَجَةٌ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (۲۲۸:۲)

طالب ہیں اور بیویوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں، جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ ہاں، البتہ مردوں کے لیے (شوہروں کی حیثیت سے) ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے اور (انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ) اللہ غالب (اور) حکمت والا ہے۔''

اس کے بعد سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا. (۱:۶۵)

''جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا شمار رکھو اور اللہ سے، جو تمھارا پروردگار ہے، ڈرتے رہو، انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں، الّا یہ کہ وہ کسی کھلی بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اور یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں، اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں گے تو انھوں

نے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ تم نہیں
جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور
صورت پیدا کر دے۔''

ان آیات سے عدت کے بارے میں جو احکام نکلتے ہیں، وہ یہ ہیں:

ا۔ عورت کے لیے نکاح کی ممانعت

'یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ'[۶] سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عدت کے اس عرصے میں عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔

ب۔ حمل چھپانے کی ممانعت

'لَا یَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ یَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِیْٓ اَرْحَامِهِنَّ'[۷] کے الفاظ سے اس بات کی تاکید کر دی گئی ہے کہ اگر عورت کو اس عدت کے دوران میں بھی یہ علم ہو جائے کہ وہ حمل سے ہے تو وہ اسے چھپا نہیں سکتی۔ اس بات سے اس طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ عدت کے احکام کی ایک اہم علت استبراے رحم ہے، یعنی یہ معلوم ہو جائے کہ عورت حمل سے نہیں ہے۔

ہم اوپر یہ بیان کر چکے ہیں کہ حاملہ کی عدت وضع حمل تک ہے۔ چنانچہ اس بات کا

---

۶ ''اپنے آپ کو روکے رکھیں گی۔''

۷ ''ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے، اسے چھپائیں۔''

امکان موجود ہے کہ کوئی عورت اپنے خاوند سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اپنا حمل پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرے تاکہ وہ تین ہی ماہ میں آزاد ہو جائے۔ قرآن مجید نے یہاں عورتوں کو اس بات سے سختی سے روک دیا ہے کہ وہ اپنا حمل چھپائیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں بچے کے نسب میں شک ہوسکتا ہے جو مستقبل میں بچے اور اس کے ماں باپ، دونوں کے لیے بہت سی پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

ج۔ مرد کے لیے رجوع کا حق

'وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ'[۸] کے ٹکڑے سے مرد کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ اگر وہ سمجھتا ہو کہ اختلافات رفع کیے جا سکتے اور اچھے طریقے سے زندگی گزاری جا سکتی ہے تو وہ عدت کے اس عرصے میں رجوع کر لے۔ یہ حق اللہ تعالیٰ نے اس بات سے مشروط کر دیا ہے کہ رجوع کرتے وقت مرد کے پیش نظر یہ بات ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ وہ عورت کو اپنے پاس رکھ کر تنگ کرنے کی کوشش کرے گا، بلکہ رجوع کا یہ حق صرف اسی صورت میں حاصل ہوتا ہے، جبکہ مرد یہ سمجھتا ہو کہ سازگاری کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اس آیت میں، چونکہ 'اَحَقُّ' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے شوہر کے مقابلے میں خواہ عورت ہو، خواہ اس کے گھر والے یا اس کے رشتہ دار، کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس معاملے کو اپنی غیرت کا مسئلہ بنا کر مرد کے رجوع کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کرے۔

۸۔ ''اور اس دوران میں، ان کے شوہر ان کو لوٹا لینے کے زیادہ حق دار ہیں۔''

اگر مرد عدت کے دوران میں رجوع کا حق استعمال نہیں کرتا تو عدت کے ختم ہونے پر عورت آزاد ہو جائے گی۔ اس کے بعد اگر دونوں ساتھ رہنے کا ارادہ کریں تو انھیں اب از سرِ نو نکاح کرنا پڑے گا۔ عدت کے ختم ہونے کے بعد مرد کو اس بات کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ عورت کی رضا کے بغیر اسے لوٹائے یا اس سے نکاح کرے۔

د۔ عدت کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھنا

سورۂ طلاق کی آیت میں 'اَحْصُوا الْعِدَّۃَ'[9] کے الفاظ سے یہ بتا دیا گیا ہے کہ اس عدت کا شمار، میاں اور بیوی، دونوں کے لیے ضروری ہے۔ بیوی کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس عرصے کے دوران میں وہ اس بات کی پابند ہے کہ کسی اور مرد کی زوجیت میں نہ جائے۔ شوہر کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس مدت کے اندر اسے یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ عورت کو بیوی کی طرح رکھنا چاہے تو رجوع کر لے۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کا یہ حق ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر اس مدت میں شوہر مر جائے تو یہ مطلقہ بیوہ کے حکم میں آئے گی اور بیوہ کے تمام حقوق و فرائض اس پر لاگو ہوں گے۔

ہ۔ عورتوں کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت

'لَا تُخْرِجُوْھُنَّ مِنْ بُیُوْتِھِنَّ وَلَا یَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ'[10] کے الفاظ سے مرد اور عورت، دونوں کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ طلاق دینے

---

[9] ''عدت کا شمار رکھو۔''

کے بعد نہ مرد کو چاہیے کہ وہ عورت کو گھر سے نکالے اور نہ عورت ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے گھر سے جائے۔ یہاں گھر سے نکلنے سے مراد وہ نکلنا نہیں ہے جو روزمرہ ضروریات کے لیے ہوتا ہے، بلکہ مستقل طور پر گھر چھوڑنا ہے۔

شوہر اور بیوی کو یکجا ایک ہی گھر میں رہنے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ باہمی سازگاری اور اصلاح احوال کی کوئی صورت ہو تو یہ یکجائی اس میں مددگار ہو جائے۔ اس حکم سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی عورت کھلی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہو تو پھر مرد اس بات کا پابند نہیں ہے کہ ایسی عورت کو عدت کے دوران میں گھر میں جگہ دے۔ 'فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' کے الفاظ سے زنا یا اس کے متعلقات ہی مراد ہیں۔ اس استثنا کی وجہ یہ ہے کہ ایسی صورت میں وہ فائدہ حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں جس کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے۔

آیۂ زیر بحث میں ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ عدت کے دوران میں ان کو 'ان' کے گھروں سے نہ نکالو، یہ نہیں فرمایا کہ ان کو 'اپنے' گھروں سے نہ نکالو۔ اس لفظ کے استعمال سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا ہے کہ عدت کے دوران میں گھر جس طرح مرد کا ہے، اسی طرح عورت کا بھی ہے۔ چنانچہ مرد کو ہرگز یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کے اپنے گھر سے نکال دے۔

۱۰؎ ''انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں، الّا یہ کہ وہ کسی کھلی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔''

اس آیت کے آخر میں 'لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰهَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا ' کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ اس آیت کے احکام کی علت جہاں استبرائے رحم اور دوسرے مصالح ہیں، وہاں ان کی ایک اہم علت یہ ہے کہ حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ طلاق کی نوبت نہ آئے اور ایک گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔ یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمائی ہے، ابوداؤد کی روایت ہے:

عن ابن عمر عن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم قال: أبغض الحلال إلی اللّٰہ تعالیٰ الطلاق. (رقم ۱۸۶۳)	''حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جائز چیزوں میں سے، طلاق اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔''

یعنی یہ کہ اپنے بندوں کی مجبوریوں کے تحت طلاق کو جائز تو رکھا ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کو اپنی جائز کی ہوئی چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔

و۔ حیثیت کے مطابق عورت کا نان ونفقہ

سورۂ طلاق میں مرد کو یہ حکم بھی دے دیا ہے کہ وہ عدت کے دوران میں اپنی مطلقہ کا نان ونفقہ فراہم کرے۔ اس معاملے میں یہ وضاحت فرما دی گئی ہے کہ یہ نان ونفقہ مرد کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ ان عورتوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انھیں خواہ مخواہ ستایا نہ جائے۔

اگر عورت حمل سے ہو تو، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اس کی عدت وضع حمل تک ممتد ہو جائے گی۔ چنانچہ اس صورت میں مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ وضع حمل تک عورت کا نان ونفقہ فراہم کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ وَلَا تُضَآرُّوۡهُنَّ لِتُضَيِّقُوۡا عَلَيۡهِنَّ وَاِنۡ كُنَّ اُولَاتِ حَمۡلٍ فَاَنۡفِقُوۡا عَلَيۡهِنَّ حَتّٰى يَضَعۡنَ حَمۡلَهُنَّ.

''ان کو رکھو، جس طرح اپنی حیثیت کے مطابق تم رہتے ہو، اور انھیں تنگی میں ڈالنے کے لیے ضرر نہ پہنچاؤ، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو، تا آنکہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔''

(الطلاق ۶۵:۶)

فصل ۲: طلاق دینے کا طریقہ

سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ. (۶۵:۱)

''جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو۔''

اس حکم کے مطابق طلاق دیتے وقت شوہر کو ان باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

۱۔ ایک طلاق دینا

عدت کے حساب سے طلاق دینے کے معنی یہ ہیں کہ شوہر جب طلاق کا فیصلہ کر

لے تو اسے چاہیے کہ عدت کی مدت اور عدت کے احکام کو ذہن میں رکھتے ہوئے طلاق دے، یعنی اس بات کا خیال رکھتے ہوئے طلاق دے کہ اس کے بعد ایک مخصوص عرصے تک عورت اس کے گھر میں رہے گی اور یہ کہ اس عرصے کے دوران میں وہ جب چاہے، اپنے فیصلے سے رجوع کر سکتا ہے اور یہ کہ اس عرصے میں اسے پہلے کی طرح عورت کا نان ونفقہ فراہم کرنا ہوگا۔

اسی طرح 'فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ جب مرد اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کر لے تو اسے چاہیے کہ ایک طلاق دے کر اپنی بیوی کو عدت گزارنے کے لیے چھوڑ دے، نہ اسے ایک ساتھ دو، تین یا ہزار، دو ہزار طلاقیں دے دینی چاہییں اور نہ عدت کے اس عرصے میں اسے کوئی اور طلاق دینی چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی جو عدت بیان فرمائی ہے، مرد کو چاہیے کہ اس عرصے کے حساب سے انھیں ایک طلاق دے۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر علیحدگی اختیار کر لی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور فرمایا:

راجع إمرأتك أم ركانة و إخوته	''اپنی بیوی ام رکانہ کو لوٹاؤ۔ اس پر
فقال: إني طلقتها ثلاثًا يا	اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ، میں
رسول اللّٰه قال: قد علمت،	اسے تین طلاقیں دے چکا ہوں۔ آپ

راجعها، و تلا: 'يَآَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَـلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'. (رقم ۱۸۷۷)

نے فرمایا: میں جانتا ہوں، تم اسے لوٹاؤ۔ اس کے بعد آپ نے (سورۂ طلاق کی آیت) 'يَآَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَـلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ' پڑھی، (اور اسے بتایا کہ یہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ نہیں ہے)۔''

اسی حکم کے پیش نظر ایک مرتبہ، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتایا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی ہیں تو آپ شدید غصے کی حالت میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

أيلعب بكتاب الله و أنا بين أظهركم، حتى قام رجل و قال: يا رسول الله ألا أقتله؟ (نسائی، رقم ۳۳۴۸)

''میری موجودگی ہی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، یہاں تک کہ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ غصہ دیکھ کر) ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ، اگر آپ حکم دیں تو میں اسے قتل کر دوں؟''

صحابۂ کرام کا عمل بھی اسی طرح سے طلاق دینے کی تائید کرتا ہے:

عن إبراهيم كانوا (أى الصحابة) يستحبون أن يطلقها واحدة

''ابراہیم سے روایت ہے کہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) یہی پسند کرتے تھے

ثم يتركها حتى تحيض ثلاث حيض. (اعلاء السنن ۱۱/۱۴۳)

کہ ایک طلاق دے کر عورت کو تین حیض تک عدت گزارنے دی جائے (اور اس عرصے میں مزید کوئی طلاق نہ دی جائے)۔''

اسی طرح ابن قاسم سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا امام مالک ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دینے کو ناپسند کرتے تھے؟ تو انھوں نے کہا:

نعم كان يكرهه أشد الكراهية ويقول: طلاق السنة أن يطلق الرجل إمرأته تطليقة واحدة طاهرًا من غير جماع ثم يتركها حتى يمضى لها ثلاثة قروء ولا يتبعها فى ذلك طلاقًا. (المدونۃ الکبریٰ ۲/۴۱۹)

''ہاں، وہ اس کو بہت ناپسند کرتے تھے اور کہتے تھے: طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے طہر میں ایک طلاق دے، جس میں اس نے صحبت نہ کی ہو۔ اس کے بعد اسے تین حیض تک چھوڑ دے اور اس دوران میں اسے مزید کوئی طلاق نہ دے۔''

اس کے بعد، ان سے سوال کیا گیا کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی کو اس طرح تین طلاقیں دینا چاہے کہ ایک طہر میں پہلی طلاق دے، اس کے بعد اگلے طہر میں دوسری طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دے تو اس معاملے میں امام صاحب کی کیا رائے تھی؟ اس پر ابن قاسم نے جواب دیا:

قال مالك: ما أدركت أحدًا من أهل بلدنا من يرى ذلك ولا يفتي به ولا أرى أن يطلقها ثلاث تطليقات عند كل طهر ولكن تطليقة واحدة ويمهل حتى تنقضي عدتها كما وصفت لك.

(المدونۃ الکبریٰ ۴۱۹/۲)

''امام مالک فرماتے ہیں: مدینہ میں کسی کی بھی یہ رائے نہیں اور نہ کسی نے اس طرح کا کوئی فتویٰ ہی دیا اور نہ میں اس کو سچ سمجھتا ہوں کہ شوہر اپنی بیوی کو ہر طہر میں ایک ایک طلاق دے۔ صحیح طریقہ وہی ہے جو میں نے بیان کیا کہ ایک طلاق دے کر بیوی کو عدت گزارنے دی جائے۔''

یہ بات ہمارے علما اور فقہا کے درمیان متفق علیہ ہے کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایک طلاق دے کر عدت گزارنے کے لیے چھوڑ دے اور عدت کے آخر تک یہ فیصلہ کر لے کہ وہ اسے بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے یا اس سے الگ ہو جانا چاہتا ہے۔ نہ اسے ایک وقت میں ایک سے زیادہ طلاقیں دینی چاہییں اور نہ عرصۂ عدت کے دوران میں اسے مزید کوئی طلاق دینی چاہیے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس طرح سے طلاق دینا صرف قرآن مجید کا حکم ہی نہیں، بلکہ اس معاملے میں سنت ثابتہ بھی یہی ہے۔

ب۔ طلاق سے پہلے عدت کا تعین

یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ عورت کے مدخولہ یا غیر مدخولہ اور حاملہ یا غیر حاملہ

ہونے سے عدت کی مدت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ 'فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ' سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ طلاق کے وقت شوہر اور بیوی، دونوں کو عدت کا عرصہ معلوم ہونا چاہیے۔ چنانچہ جس طہر میں مرد نے عورت کے ساتھ صحبت کی ہو، اس طہر میں اسے طلاق نہیں دینی چاہیے، کیونکہ اس وقت یہ بات معلوم نہیں ہو سکتی کہ عورت کی عدت تین حیض ہوگی یا اسے حاملہ کی عدت گزارنی ہوگی۔ مسلم کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فليطلقها قبل أن يجامعها. (رقم ۲۶۷۷)

''اسے چاہیے کہ وہ اسے ایسی حالت میں طلاق نہ دے کہ اس نے اس کے ساتھ مجامعت کی ہو۔''

اس حکم کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ مرد و عورت، دونوں کو یہ معلوم ہو کہ ان کو کتنا عرصہ عدت کے احکام کی پابندی کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر مرد کو یہ معلوم ہو کہ اسے کتنے عرصے تک عورت کو اپنے گھر میں رکھنا اور اس کا نان و نفقہ فراہم کرنا ہوگا اور عورت یہ جانتی ہو کہ اسے کتنے عرصے تک مرد کے فیصلے کا انتظار کرنا ہوگا۔ اور یہ کہ وہ کتنی مدت تک کسی اور سے نکاح نہیں کر سکتی۔

اس حکم کا یہ نتیجہ بھی ہوگا کہ اگر طلاق کی وجہ کوئی وقتی ناراضی بن رہی ہے یا غصے اور جذبات میں آ کر یہ فیصلہ کیا جا رہا ہے تو اس طرح کے توقف سے فریقین کی یہ ناراضی آپ سے آپ دور ہو جائے اور شوہر کے لیے طلاق دینے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ہمارے فقہا کے درمیان یہ مسئلہ بھی متفق علیہ ہے کہ مرد کو ایسے طہر میں طلاق نہیں دینی چاہیے جس میں اس نے عورت سے مجامعت کی ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ طلاق کے معاملے میں سنت ثابتہ بھی یہی ہے۔

ج۔ حیض میں طلاق نہ دینا

اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق کی زیر بحث آیت میں صحیح طریقے سے طلاق دینے، عدت کو ٹھیک ٹھیک شمار کرنے اور عدت کے دوران میں شوہر اور بیوی کو ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد اس آیت کے آخر میں ان تمام احکام کی علت بھی بیان فرما دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَدۡرِیۡ لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا. (الطلاق ۶۵:۱)

''تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔''

جیسا کہ پہلے بھی یہ بیان ہو چکا ہے، آیت کے اس حصے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سارے احکام اس لیے دیے ہیں کہ جس حد تک ممکن ہو سکے طلاق واقع ہونے سے روکی جائے اور ایک گھر ٹوٹنے سے بچایا جائے۔

اس علت کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام حیض میں طلاق دینے سے روکا ہے۔ ایام حیض میں چونکہ مرد و عورت کے مابین ایک نوعیت کا بُعد پیدا ہو جاتا ہے، اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ حیض کے دن گزرنے کے بعد آدمی طلاق دینے کا فیصلہ ترک کر دے۔ یہ بات آپ نے اس وقت واضح فرمائی، جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ

نے آپ کو بتایا کہ ان کے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ نے ایام حیض میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا:

مره فليراجعها ثم ليطلقها طاهرًا أو حاملًا. (مسلم، رقم ۲۶۸۰)

''اس سے کہو کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے اور پھر (اگر چاہے تو) اسے طہر یا حمل کے واضح ہو جانے کے بعد طلاق دے۔''

اسی علت کے پیش نظر، یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ طلاق دینے کا فیصلہ غصے یا جذبات میں آ کر نہیں، بلکہ سوچ سمجھ کر اور پورے شعور کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔

فصل ۳: دیگر احکام

سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۸ میں عدت کا عرصہ اور اس دوران میں مرد و عورت کے لیے احکام دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے طلاق سے متعلق چند اور احکام دیے ہیں۔ یہاں پر ہم ان احکام کو قرآن مجید ہی کی ترتیب کے مطابق درج کیے دیتے ہیں:

۱۔ رجوع کا حق دو مرتبہ حاصل ہے

سورۂ بقرہ میں عدت گزارنے کا حکم اور اس دوران میں مرد کو رجوع کا حق دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌ

''یہ طلاق (جس کے بعد عدت کے

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ. (البقرہ۲:۲۲۹)

دوران میں مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے) دو مرتبہ ہے۔ چنانچہ (ان دونوں طلاقوں کے بعد) دستور کے مطابق روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا۔''

یعنی وہ طلاق[۱۱] جس کے بعد مرد کو عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کا حق حاصل ہے، نکاح کے بعد دو مرتبہ ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے تو اسے تین حیض کے عرصے کے اندر اندر یہ آخری فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی بیوی سے الگ ہو جانا چاہتا ہے یا اسے پہلے کی طرح اپنے گھر میں رکھنا چاہتا ہے۔ پھر اگر وہ رجوع ہی کا فیصلہ کرتا ہے اور اس کے بعد کبھی کسی وجہ سے دوبارہ طلاق کی نوبت آجاتی ہے تو اسے ایک مرتبہ پھر طلاق دینے کے بعد یہ حق حاصل ہے کہ وہ عدت کے دوران میں طلاق کے فیصلے سے رجوع کر لے۔

اس طرح سے، خواہ پہلی مرتبہ یا دوسری مرتبہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد عدت کے دوران میں رجوع نہیں کرتا تو عورت عقد نکاح سے آزاد ہو جائے گی۔ اب اگر مرد

---

[۱۱] قرآن مجید کی اس آیت میں لفظ ''طلاق'' پر لام عہد ہے اور اس کا معہود وہ طلاق ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں ہوا، یعنی وہ طلاق جس کے بعد شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔

اسے اپنی بیوی بنا کر رکھنا چاہے تو اسے عورت کی آزادانہ مرضی کے ساتھ اس سے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔

غور کیجیے تو اس آیت سے بھی یہ بات نکلتی ہے کہ شوہر جب طلاق دینے کا فیصلہ کر لے تو اسے ایک طلاق ہی دینی چاہیے اور اس کے بعد عدت کے آخر تک اپنی بیوی کو رخصت کر دینے یا اس سے رجوع کر لینے کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔ اگر کوئی شخص ایک ہی وقت میں دو، تین یا بیس طلاقیں دے دے تو وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کو چھوڑتا اور اس میں پائی جانے والی حکمتوں کو پامال کرتا ہے[۱۲]۔

ب۔ ''تسریح باحسان[۱۳]'' کے معنی

اگر شوہر عدت کے آخر میں اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اب وہ اور اس کی بیوی اکٹھے رہتے ہوئے اچھے طریقے سے زندگی نہیں گزار سکتے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کو احسان کے ساتھ رخصت کر دے۔ احسان کے ساتھ رخصت کرنے کو قرآن مجید نے خود واضح فرما دیا ہے۔

اس باب میں جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۲؎ اگر کسی شخص نے اس طرح سے ایک ہی وقت میں تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے دی ہیں تو اس پر کیا حکم جاری ہوگا؟ اس مسئلے پر ہم آگے تفصیل سے بحث کریں گے۔

۱۳؎ خوش اسلوبی سے رخصت کرنا۔

۱۔ جو کچھ بیوی کو دیا جا چکا ہے، وہ واپس لینے کی ممانعت

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ. (۲۲۹:۲)

''یہ طلاق دو مرتبہ ہے۔ چنانچہ دستور کے مطابق روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر دینا۔ اور (اگر تم رخصت کرنے کا فیصلہ کرو تو) تمھارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ انھیں دیا ہے، اس میں سے کچھ بھی واپس لو، مگر صرف اس صورت میں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کی پاس داری نہیں کر سکیں گے۔ پس اگر تمھیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے دے۔ یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی لوگ ظالم ہیں۔''

اس آیت کے مطابق بیوی کو رخصت کرتے وقت اس سے ازدواجی زندگی کے دوران میں دیے گئے زیورات، زمینیں، مکان اور کسی بھی قسم کے تحائف وغیرہ واپس لینا مرد کے لیے ممنوع ہے۔ 'مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ'[14] سے مہر یا نان ونفقہ مراد لینا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ان چیزوں کے واپس کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ یہ سب تو عورت کا حق ہیں۔ آیت کے الفاظ عموم پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جو شوہر نے بیوی کو دی ہوں۔

اسی بات کو سورۂ نساء میں اور بھی زیادہ تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ	''اور یہ بات جائز نہیں ہے کہ جو
مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ	کچھ تم نے ان کو دیا ہے، اس میں
بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ	سے کچھ واپس لینے کے لیے انھیں
بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ	تنگ کرو، مگر صرف اس صورت میں
فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ	کہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب
اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا وَاِنْ اَرَدْتُّمُ	ہوئی ہوں۔ اور ان کے ساتھ معقول
اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ	طریقے کا برتاؤ کرو۔ اگر تم انھیں
وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا	ناپسند کرتے ہو تو بعید نہیں کہ ایک چیز

[14] ''جو کچھ تم نے انھیں دیا۔''

تَـاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا. (۴:۱۹-۲۱)

کوتم ناپسند کرو اور اللہ تمھارے لیے اس میں بہت خیر پیدا کردے۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو اور تم نے ایک کو ڈھیروں مال دے رکھا ہو تو بھی اس میں سے کچھ نہ لو۔ کیا تم بہتان لگا کر اور کھلی حق تلفی کر کے اسے لو گے؟ اور تم کس طرح یہ مال لو گے، جبکہ تم ایک دوسرے کے سامنے بے حجاب ہو چکے ہو اور ان کا تمھارے ساتھ ایک مضبوط تعلق رہا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے اور بھی زیادہ وضاحت سے یہ بات بیان کر دی ہے کہ شوہر نے بیوی کو کتنا ہی مال دے رکھا ہو، اگر وہ اسے طلاق دینے کا فیصلہ کرے تو اس کے لیے اس میں سے کچھ بھی واپس لینا جائز نہیں ہے۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس حکم سے جہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ مرد کی فتوت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ عورت کو دیے ہوئے مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لے، وہیں اس حکم کی وجہ سے یہ بات بھی پیدا ہوگئی ہے کہ طلاق کا فیصلہ عجلت اور غصے یا جذبات میں آ

کرنہیں کرنا چاہیے۔اس پابندی کی وجہ سے مرد کے لیے طلاق دینا کوئی کھیل نہیں رہا۔ اب اسے اچھی طرح سے اس بات پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ طلاق دینے کے نتیجے میں اسے اس سارے مال سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا جو وہ اپنی بیوی کو دے چکا ہے۔

دو استثنا

سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کی ان دو آیتوں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اس بات سے روکا ہے کہ رخصت کرتے وقت شوہر اپنی بیوی سے ہرگز وہ مال واپس نہ لے جو وہ اسے دے چکا ہے، وہاں اس ممانعت سے دو مستثنیات بھی بیان فرما دیے ہیں:

پہلا استثنا یہ بیان ہوا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت کے مطابق اگر مرد و عورت، دونوں یہ محسوس کریں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حسن و خوبی سے رہ تو نہیں سکتے، مگر مرد صرف اس وجہ سے طلاق دینے پر آمادہ نہیں کہ اس نے بہت زیادہ مال عورت کے حوالے کر دیا ہے اور طلاق کی صورت میں اسے اس سارے ہی مال سے ہاتھ دھونا پڑے گا تو اس معاملے کو معاشرے اور عدالت کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔ پھر اگر عدالت اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ واقعی دونوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا اور مرد کے لیے صرف یہی بات طلاق میں رکاوٹ بن رہی ہے کہ اس کا مال جاتا رہے گا تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ عورت کچھ مال لوٹا کر اس سے آزادی حاصل کر لے۔

دوسرا استثنا سورۂ نساء میں یہ بیان ہوا ہے کہ اگر بیوی کسی کھلی بدکاری کی مرتکب

ہوئی ہو تو مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنا دیا ہوا مال اور تحائف وغیرہ اس سے واپس لے سکتا ہے۔ اس کے بعد اس بات سے بھی سختی سے روک دیا ہے کہ صرف مال لینے کے لیے کوئی شخص اپنی بیوی پر ہرگز کوئی تہمت نہ لگائے، اگر کسی نے ایسا کیا تو قرآن مجید کے نزدیک یہ 'بہتان' اور 'کھلی حق تلفی' ہے جس کی سزا دنیا اور آخرت، دونوں میں بڑی سخت ہے۔

یہ بات ہم پہلے بھی عرض کر چکے ہیں کہ یہاں مہر یا نان ونفقہ ہرگز زیر بحث نہیں ہے۔ چنانچہ کسی بھی حالت میں عورت کو مہر یا نان ونفقہ لوٹانے کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔

۲۔ عورت سے تعلق قائم کرنے یا مہر مقرر کرنے سے پہلے طلاق دینا

''تسریح باحسان'' ہی کی وضاحت میں سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح فرما دیا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنے یا اس کا مہر مقرر کرنے سے پہلے[۱۵] اسے طلاق دے دے تو اس صورت میں اس پر مہر کے معاملے میں تو کوئی پابندی نہیں ہے، مگر احسان کا رویہ یہی ہے کہ اس موقع پر اپنی حیثیت کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔

۱۵؎ اگرچہ قرآن مجید اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ بیوی سے تعلق قائم کرنے سے پہلے اس کا مہر متعین کر لینا چاہیے، لیکن اس حکم کی رو سے اگر کسی وجہ سے بیوی کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تو، خواہ وہ مدخولہ ہو یا غیر مدخولہ اس کے مہر کے معاملے میں مرد پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔

اسی طرح اگر زن وشو کا تعلق قائم ہونے سے پہلے، مگر مہر متعین کیے جانے کے بعد طلاق ہوئی ہے تو اس صورت میں قانون یہ ہے کہ مرد کو مقرر شدہ مہر کا آدھا بیوی کو دینا ہوگا، لیکن اگر بیوی اپنی مرضی سے مہر کا یہ آدھا حصہ بھی معاف کر دینا چاہے تو وہ کر سکتی ہے اور اگر شوہر اپنی مرضی سے اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے پورا مہر ادا کرنا چاہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ اس معاملے میں قرآن مجید نے مرد کو یہ نصیحت کی ہے کہ اس کی فتوت وغیرت اور خاندانی نظام میں اس کو ترجیح کا جو ایک درجہ حاصل ہے، اس کے پیش نظر اس کے شایان شان یہی ہے کہ وہ اس رخصت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عورت کو مہر کی پوری ہی رقم ادا کر دے۔ علاوہ ازیں یہی بات تقویٰ کے بھی قریب تر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ	''اگر تم عورتوں کو اس صورت میں
النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ	طلاق دو کہ تم نے انھیں ہاتھ نہ لگایا ہو
تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً وَّمَتِّعُوْهُنَّ	یا ان کے لیے مہر مقرر نہ کیا ہو تو (ان کے
عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى	مہر کے باب میں) تم پر کوئی گناہ نہیں۔
الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ	البتہ انھیں دستور کے مطابق دے دلا
حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ وَاِنْ	کر رخصت کرو، صاحب وسعت اپنی
طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ	وسعت کے مطابق اور غریب اپنی

وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ.

(البقرہ۲:۲۳۶-۲۳۷)

حالت کے مطابق، یہ محسنین پر حق ہے۔ اور اگر تم نے انھیں طلاق تو دی ہاتھ لگانے سے پہلے، لیکن ان کے لیے ایک متعین مہر ٹھہرا چکے ہو تو مقررہ مہر کا آدھا ادا کرو، الّا یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑیں یا وہ اپنا حق چھوڑے جس کے ہاتھ میں سررشتہ نکاح ہے اور یہ کہ تم اپنا حق معاف کرو، تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ اور تمھارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے، اسے نہ بھولو۔ بے شک، جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۲۳۶ کے آخر میں 'حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ' کہہ کر یہ بھی واضح فرما دیا کہ یہ احکام ''تسریح باحسان'' ہی کی شرح و وضاحت ہیں۔

۳۔ کچھ دے دلا کر عورت کو رخصت کرنا

سورۂ بقرہ میں طلاق کا قانون بیان کرنے کے بعد اس سلسلۂ کلام کو اس ہدایت پر ختم کیا ہے:

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ. (۲:۲۴۱)

''اور مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق کچھ دینا دلانا چاہیے۔ یہ خدا سے ڈرنے والوں پر حق ہے۔''

اس آیت میں ایک مرتبہ پھر اس بات کی تاکید کر دی گئی ہے کہ عورتوں کو رخصت کرتے وقت ازدواجی زندگی کے دوران میں دی گئی چیزیں ان سے واپس لینا تو درکنار، اللہ سے ڈرنے والوں کو انھیں کچھ دے دلا کر ہی رخصت کرنا چاہیے۔

رہا یہ سوال کہ مرد کے لیے یہ دینا دلانا فرض ہے یا نہیں؟ تو اس کے جواب میں مولانا امین احسن اصلاحی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''...جو حقوق صفات و کردار پر مبنی ہوتے ہیں بعض حالات میں وہ اس دنیوی زندگی میں تو قانون کی گرفت کے دائرے سے باہر ہوتے ہیں، لیکن خدا کے ہاں ان صفات کے لیے وہ حقوق ہی معیار ٹھہریں گے۔ اگر ایک چیز مومنین یا محسنین یا متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرے، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آخرت میں بھی ان کی خلاف ورزی پر کوئی اثر مترتب نہیں ہوگا۔ آخرت میں آدمی کا ایمان یا احسان یا تقویٰ انھی حقوق کی ادائیگی یا عدم ادائیگی کے اعتبار سے وزن دار یا بے وزن ٹھہرے گا۔'' (تدبر قرآن ۱/۵۵۶)

یہ سب وہ ہدایات ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ''تسریح باحسان'' کی

وضاحت میں بیان فرمائی ہیں۔

ج۔ ''امساک بمعروف[16]'' کے معنی

جس طرح اللہ تعالیٰ نے خود ''تسریح باحسان'' کو واضح فرما دیا ہے، اسی طرح ''امساک بمعروف'' کی وضاحت بھی فرما دی ہے۔ قرآن مجید نے جہاں مرد کو اپنی مطلقہ کو لوٹا لینے کا حق دیا ہے، وہیں اس پر یہ شرط بھی عائد کر دی ہے کہ یہ حق شوہر کو صرف اس صورت میں حاصل ہے، اگر وہ سازگاری اور حسن وخوبی سے نباہ کرنا چاہتا ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِیْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا. (البقرہ ۲:۲۲۸)

''اور اس (عدت کے) دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حق دار ہیں، اگر وہ سازگاری کے طالب ہیں۔''

آگے چل کر اسی بات کو منفی طریقے سے بھی بیان کر دیا:

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا

''اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو، پھر وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو انھیں دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق رخصت کر دو۔ اور انھیں نقصان

---

[16] ''دستور کے مطابق روک لینا۔''

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا. (البقرہ۲:۲۳۱)

پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ۔''

اس آیت میں اس بات کی صراحت کر دی گئی ہے کہ اگر مرد اپنا حق رجوع استعمال کرتا ہے تو اس رجوع کا مقصد ہرگز عورت کو اپنا اسیر بنا کر رکھنا یا اسے تنگ کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ رجوع کرنے کا حق مرد کو صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ ایک گھر ٹوٹنے سے بچ سکے۔ اگر اس حق کا غلط استعمال کر کے مرد عورت کو تنگ کرتا یا اسے اذیت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سب سے بڑا ظلم اپنی ہی جان پر کرتا ہے، کیونکہ اللہ کے حدود سے تجاوز کرنے یا اس کی شریعت کا مذاق اڑانے کی سزا دنیا اور آخرت، دونوں میں بڑی ہی سخت ہے۔

د۔ فیصلہ کرتے وقت گواہ بنا لینا

عدت کے آخر میں جب شوہر اپنی بیوی سے رجوع کرنے یا اسے رخصت کر دینے کا فیصلہ کرے تو اسے اس فیصلے پر دو ثقہ لوگوں کو گواہ بنا لینا چاہیے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ

''پھر جب وہ عورتیں اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو انھیں دستور کے مطابق نکاح

وَّاَشْهِدُوْا ذَوَیْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ. (الطلاق ۶۵:۲) میں رکھو یا دستور کے مطابق جدا کر دو اور اپنے میں سے دو ثقہ آدمی گواہ بنا لو۔''

اس آیت میں طلاق دینے والوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب وہ عدت کے آخر میں کوئی بھی فیصلہ کریں تو انھیں چاہیے کہ وہ اپنے فیصلے پر دو آدمی گواہ بنا لیں تا کہ اس فیصلے پر آیندہ وراثت یا اس طرح کی کسی اور نزاع کا امکان باقی نہ رہے۔

اس آیت میں چونکہ خطاب عام مسلمانوں سے ہے، عدالت یا ریاست سے نہیں، اس وجہ سے اس کی حیثیت قانون کی نہیں، بلکہ تلقین و نصیحت کی ہے۔ اگر مسلمان اپنے معاملات میں اس طرح کی ہدایات کا خیال رکھیں گے تو یہ یقیناً خیر و برکت ہی کا باعث بنے گا، لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا خیال نہیں رکھتا اور بغیر گواہوں کے اپنی بیوی سے رجوع کر لیتا یا اسے جدا کر دیتا ہے تو اگرچہ وہ اس ہدایت کی برکتوں سے محروم رہے گا، مگر ایسا نہ کرنے سے قانون کی نگاہ میں اس کے فیصلے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

۵۔ تیسری طلاق کے احکام

اوپر ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ مرد کو ایک عورت کے ساتھ نکاح کے بعد دو مرتبہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران میں عورت کو لوٹا لے یا عدت ختم ہونے کے بعد اگر عورت راضی ہو تو اس سے دوبارہ نکاح کر لے۔ اگر کوئی

شخص ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران میں اپنی بیوی کو لوٹا لیتا ہے اور پھر کسی وجہ سے زندگی میں دوبارہ طلاق دیتا ہے اور اسی طرح عدت کے دوران میں لوٹا لیتا ہے اور اس کے بعد پھر کسی وجہ سے اسے تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دیتا ہے تو اس صورت میں قرآن مجید اس شخص پر اس کی بیوی کو قطعی طور پر حرام کر دیتا ہے۔ اب یہ شخص اپنی بیوی کو لوٹا سکتا ہے اور نہ اس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں قرآن مجید نے، البتہ ایک خاص صورت بیان کی ہے جس کے پیش آ جانے کے بعد فریقین ایک مرتبہ پھر عقد نکاح میں بندھ سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ. (البقرہ۲:۲۳۰)

''پھر اگر وہ (ان دو طلاقوں کے بعد) اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں ہے، تا آنکہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کر لیں، اگر وہ توقع رکھتے ہوں کہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں۔''

قرآن مجید کے اس بیان کے مطابق تیسری طلاق دینے کے بعد مرد کے لیے اس کی یہ مطلقہ بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اب اگر عورت کو کسی سے نکاح کرنا ہی ہے تو وہ کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ اس کے بعد اگر کسی وجہ سے وہ بھی اسے طلاق دے دیتا ہے[۱۷] یا اس شخص کا انتقال ہو جاتا ہے[۱۸] تو پھر یہ عورت اور اس کا پہلا شوہر اپنی آزادانہ مرضی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت قرآن مجید نے اس بات سے مشروط کر دی ہے کہ یہ نکاح صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے، جب فریقین یہ سمجھتے ہوں کہ اب وہ باہم حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزار سکتے اور اس طرح اللہ کے حدود کی پاس داری کر سکتے ہیں۔

تیسری طلاق کے بعد فریقین کے ملاپ میں یہ ہفت خوان حائل کرنے کی وجہ یہ

۱۷؎ اس طلاق کے بعد وہ تمام احکام اسی طرح سے جاری ہوں گے، جس طرح ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ طلاق کے بعد عورت اپنے حالات کے لحاظ سے عدت گزارے گی۔ اس عدت کے دوران میں عورت کسی سے نکاح نہیں کر سکتی اور مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے رجوع کر سکتا ہے۔

۱۸؎ اگرچہ قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق اگر دوسرا شوہر عورت کو طلاق دے تب عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہوتی ہے، مگر اشتراک علت کے باعث اگر عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور کچھ عرصے بعد مرد کا انتقال ہو جائے تو اس صورت میں عورت اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کے لیے حرام نہیں رہے گی۔

ہے کہ طلاق بچوں کا کھیل بن کر نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ پابندی لگا دینے کے بعد اب جو شخص بھی اپنی بیوی کو تیسری بار طلاق دے گا، وہ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کرے گا اور اسلام کا منشا بھی یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے، وہ خوب سوچ سمجھ کر اور دور تک سارے نتائج سامنے رکھ کر ہی ایسا کرے۔

حلالہ

جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، قرآن مجید کے مطابق اگر ایک شخص اپنی بیوی کو زندگی میں تیسری طلاق بھی دے دے تو اب وہ اس سے صرف اسی صورت میں نکاح کر سکتا ہے اگر وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور پھر کسی وجہ سے اس کا یہ دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے۔

اگر کوئی مرد و عورت، اس نیت سے نکاح کریں کہ اس نکاح کے بعد مرد عورت کو طلاق دے کر اسے اس کے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے کا حیلہ فراہم کرے گا تو اس کے لیے ''حلالہ'' کی اصطلاح مستعمل ہے۔

لفظ ''نکاح'' شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق مرد و عورت کے اس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جس میں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بھر کے نباہ کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر زندگی بھر کے نباہ کا یہ ارادہ کسی نکاح میں نہیں پایا جاتا تو وہ نکاح نہیں، بلکہ ایک سازش ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں۔

شریعت نے نکاح کے ساتھ طلاق صرف کسی افتاد کے تدارک کے طور پر رکھی ہے۔ چنانچہ نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے، اس وجہ سے ہمارے نزدیک حلالہ قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے اور اس کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ جو شخص حلالہ کی نیت سے کسی عورت کے ساتھ مل کر یہ سازش کرتا ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں ''تیس مستعار'' یعنی کرائے کے سانڈ کا کردار ادا کرتا ہے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لعن اللّٰہ المحلل و المحلل له. (ابوداؤد، رقم ۱۷۷۸)

''حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام میں حلالہ قطعاً حرام ہے۔ اسی بات کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

لا أوتی بمحلل و ما محلل له إلا رجمتهما. (الکشاف، زمخشری ۲۷۶/۱)

''اگر میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، لائے گئے تو میں ان کو لازماً رجم کر دوں گا۔''

نکاح میں مباشرت یا وطی کی شرط

فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے بیاہ

کر کے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کر لیتی، اس وقت تک وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں صرف سعید بن میبّب کی یہ رائے ہے کہ مجرد نکاح سے عورت کی حرمت ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک سعید بن میبّب کی رائے ہی صحیح ہے۔

جن حضرات نے عورت کے اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے میں جماع کو شرط مانا ہے، انھوں نے اپنی رائے کے حق میں تین اہم دلائل پیش کیے ہیں۔ ہم یہاں ان دلائل کا بھی جائزہ لیں گے۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے حکم 'حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ'[19] میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے، جبکہ نکاح عورت نہیں، مرد کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں پر 'تَنۡکِحَ' سے مراد وطی کرنا ہے، یعنی جب تک عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی نہ کر لے۔

دوسری یہ کہ 'زَوۡجًا غَیۡرَہٗ' میں 'زوج' کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ بیاہ تو ہو چکا، چنانچہ اب 'تَنۡکِحَ' سے مراد وطی ہی ہو سکتی ہے۔

تیسری یہ کہ ایک روایت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو اپنے پہلے شوہر کے پاس جانے سے اس وقت تک روک دیا، جب تک اس کا دوسرا شوہر اس سے جماع نہ کر لے۔

---

[19] ''جب تک وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے۔''

پہلی اور دوسری بات کا جواب خود قرآن مجید ہی نے دے دیا ہے۔ آیۂ زیر بحث کے صرف ایک آیت بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ. (البقرہ ۲:۲۳۲)

''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ بنو کہ وہ اپنے ہونے والے شوہروں سے نکاح کریں۔''

اس آیت میں بھی نکاح کے فعل کی نسبت عورتوں ہی کی طرف ہے اور 'زوج' ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر بالبداہت واضح ہے کہ یہاں نکاح سے مراد وطی نہیں، بلکہ عقد نکاح ہی ہے۔

مزید یہ کہ جن حضرات نے 'تَنْكِحَ' کے فعل سے وطی اس لیے مراد لیا ہے کہ نکاح کے فعل کی نسبت عورت کی طرف درست نہیں، کیونکہ نکاح عورت نہیں، مرد کرتا ہے، انھوں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ وطی بھی عورت نہیں، مرد ہی کرتا ہے تو پھر فعل وطی کی نسبت عورت کی طرف کس طرح درست ہوگی؟

تیسری بات کے جواب سے پہلے ہم یہ بات بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک روایات سے احکام کے استنباط کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے متعلقہ مسئلے کی تمام روایات کو جمع کر کے یہ دیکھا جائے کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟ اس کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ اس مسئلے کی اساس قرآن، سنت یا عقل عام میں سے کس چیز پر قائم ہے؟

زیر بحث مسئلے پر تمام روایات جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ مرد وعورت میں زن وشو کا تعلق قائم ہوا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک ان روایات میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ عورت نے نکاح کیا ہی اس مقصد سے تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے اور اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس بات سے روک دیا۔[۲۰]

چنانچہ یہ واقعہ حلالہ کی ممانعت کا ایک ثبوت ہے نہ کہ نکاح میں وطی یا جماع کے شرط ہونے کا۔ اس طرح سے دیکھیے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم قرآن مجید ہی کی اساس پر مبنی ہے۔

اس واقعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگر اس بات پر اطمینان ہو جائے کہ عورت نے صرف اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے کی غرض سے نکاح کیا ہے تو، خواہ اس کے دوسرے شوہر نے اس سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو، عدالت اسے اپنے پہلے شوہر کے پاس جانے سے روک سکتی ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ نکاح کے بعد وطی یا جماع کا حکم قرآن کی کسی آیت سے نکالنے

۲۰؎ اس سلسلہ میں ایک مفصل روایت اس فصل کے آخر میں درج کر دی گئی ہے جس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرد وعورت کے درمیان زن وشو کا تعلق قائم ہونے کے بعد بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے عورت کو اپنے پہلے شوہر کے پاس جانے سے روک دیا کہ اس نے نکاح کیا ہی اس نیت سے تھا کہ وہ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کر سکے۔

کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ زن وشو کا یہ تعلق نکاح کی فطرت ہی میں موجود ہے۔ باقی رہ گئی یہ بات کہ اگر زن وشو کے تعلق سے پہلے طلاق ہو جاتی ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ ہمارے نزدیک اس سے نکاح کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل خود قرآن میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ. (البقرہ ۲:۲۳۶)

''(ان عورتوں کے مہر کے باب میں) تم پر کوئی گناہ نہیں جنھیں تم ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو''

اگر نکاح میں صحبت یا مباشرت کو شرط کی حیثیت حاصل ہوتی تو یقیناً قرآن مجید اس مقام پر اس بات کو واضح کر دیتا۔ اس کے برعکس، اس آیت میں غیر مدخولہ مطلقات کے نکاح کو ہرگز باطل قرار نہیں دیا گیا۔

مطلقہ کو گھر میں رکھنا اور نان ونفقہ فراہم کرنا

اس مضمون کی پہلی فصل میں ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ سورۂ طلاق کے حکم 'لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ[۲۱]' کی وجہ سے طلاق کے بعد عدت کے عرصے میں نہ مرد کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ مطلقہ کو گھر

۲۱ ''انھیں ان کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی نکلیں، الّا یہ کہ وہ کسی کھلی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں۔''

سے نکال دے اور نہ عورت ہی کے لیے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر چلی جائے۔ اسی طرح ہم وہاں یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ سورۂ طلاق کے حکم 'اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ'[۲۲] کے تحت مرد کو یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ وہ عدت کے دوران میں اپنی مطلقہ کا نان ونفقہ فراہم کرے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا تیسری طلاق کے بعد بھی عورت عدت کا عرصہ اپنے شوہر ہی کے گھر میں گزارے گی یا اب اسے یہ گھر چھوڑنے کی اجازت ہے؟ اسی طرح تیسری طلاق کے بعد بھی نان ونفقہ فراہم کرنا شوہر کی ذمہ داری ہوگی یا نہیں؟

اس مسئلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جس طرح سورۂ طلاق میں مطلقات کو گھروں میں رکھنے اور ان کا نان ونفقہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس میں اس بات کی کوئی گنجایش نہیں ہے کہ ان کو دو الگ الگ حکم مانا جائے، یعنی نان ونفقہ فراہم کرنا دراصل مطلقات کو گھروں میں رکھنے ہی کی تفصیل ہے[۲۳]۔ چنانچہ جب مطلقات کو گھروں

۲۲؎ ''ان کو رکھو، جس طرح اپنی حیثیت کے مطابق تم رہتے ہو۔''

۲۳؎ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ طلاق کی آیت ۶ میں نان ونفقہ فراہم کرنے کا حکم 'اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ مِّنۡ وُّجۡدِكُمۡ' بغیر کسی حرف عطف کے آ گیا ہے اور غور کیجیے تو اس میں ضمیر منصوب کا مرجع وہی عورتیں ہو سکتی ہیں جن کا ذکر سورہ کی پہلی آیت میں ہوا ہے۔ چنانچہ 'اَسۡكِنُوۡهُنَّ مِنۡ حَيۡثُ سَكَنۡتُمۡ...' والا حصہ سورہ کی پہلی آیت کے حکم 'لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ' ہی کی تفصیل اور وضاحت ہے۔

میں رکھنا ضروری ہوگا تو لازماً مرد کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ اپنی حیثیت کے مطابق، ان کا نان ونفقہ بھی فراہم کرے۔ چنانچہ عام حالات میں بیویوں کو گھروں میں رکھنے اور ان کا نان ونفقہ فراہم کرنے کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پہلی دو طلاقوں کی طرح، تیسری طلاق کے بعد بھی مرد کو اپنی مطلقہ کا سکنیٰ[۲۴] اور نفقہ، دونوں فراہم کرنے ہوں گے یا اس کے برعکس، ان دونوں کی ذمہ داری مرد پر نہیں ڈالی جا سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے جس مقام پر مطلقات کو گھروں سے نکال دینے کی ممانعت آئی ہے، وہاں طلاق کا عمومی قانون ہی زیر بحث ہے، یعنی وہاں اس طلاق کا قانون بیان ہو رہا ہے جس کے بعد مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ	''جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی
لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا	عدت کے حساب سے طلاق دو اور
اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ	عدت کا شمار رکھو اور اللہ سے جو تمھارا
بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ	پروردگار ہے، ڈرتے رہو۔ انھیں ان
يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ وَتِلْكَ	کے گھروں سے نہ نکالو اور نہ وہ خود ہی
حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ	نکلیں، الّا یہ کہ وہ کسی کھلی بدکاری کی
اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ لَا تَدْرِيْ	مرتکب ہوں۔ اور یہ اللہ کے مقرر کیے

۲۴ 'سکنیٰ' سے مراد عورت کو گھر میں رکھنا ہے۔

لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ. (الطلاق ۶۵:۱-۲)

ہوئے حدود ہیں اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں گے تو انھوں نے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔ پھر جب وہ اپنی مدت پوری کر چکیں تو انھیں معروف کے مطابق روک لو یا معروف کے مطابق رخصت کر دو۔''

غور کیجیے، آیت ۲ کے الفاظ 'فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ'[۲۵] پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہاں وہی طلاق زیر بحث ہے جس کے بعد شوہر کو رجوع کا حق حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح پہلی آیت کے آخر میں 'لَا تَدْرِیْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا'[۲۶] کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ نے خود اس بات کی طرف بھی اشارہ فرما دیا ہے کہ طلاق کے بعد عورتوں کو پہلے کی طرح گھروں میں رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ حتی الامکان یہ کوشش

۲۵ ''پھر جب وہ اپنی مدت پوری کر چکیں تو انھیں معروف کے مطابق روک لو یا معروف کے مطابق رخصت کر دو۔''

۲۶ ''تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔''

کی جائے کہ مفارقت کی نوبت نہ آئے اور ایک گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ شوہر اور بیوی کو یکجا ایک ہی گھر میں رہنے کا حکم اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ باہمی سازگاری اور اصلاح احوال کی کوئی صورت ہو تو یہ یکجائی اس میں مددگار ہو جائے۔ ظاہر ہے، یہ صورت اسی طلاق میں پیدا ہو سکتی ہے جس کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہو۔ تیسری طلاق کے بعد چونکہ مرد کے لیے عورت سے رجوع کرنے یا اس سے دوبارہ نکاح کرنے کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اس وجہ سے وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس کے پیش نظر قرآن مجید نے اس پر اور اس کی مطلقہ پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ عدت کے دوران میں ایک ہی گھر میں رہیں اور پہلے کی طرح مرد اس کا خرچ برداشت کرے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک تیسری طلاق کے بعد عورت کا نان ونفقہ اور سکنیٰ فراہم کرنا مرد کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

اس معاملے میں قرآن مجید کی رو سے صرف ایک صورت مستثنیٰ ہے جس میں تیسری طلاق کے بعد بھی مرد کو عورت کے نان ونفقے کا انتظام کرنا ہوگا[۲۷]، وہ صورت یہ ہے کہ عورت حاملہ ہو۔

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ ''اور مائیں اپنے بچوں کو، ان لوگوں

۲۷؎ اس صورت میں بھی سکنیٰ کی ذمہ داری مرد پر نہیں ڈالی گئی۔

حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ.

(۲۳۳:۲)

کے لیے پورے دو سال دودھ پلائیں گی جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہیں۔ اور بچے کے باپ کے ذمے، بچے کی ماں کا دستور کے مطابق، کھانا اور کپڑا ہے۔ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو، اس کے بچے کے سبب سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اور اسی طرح کی ذمہ داری وارث پر بھی ہے۔ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑا دینا چاہیں تو ان پر کوئی حرج نہیں۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی تم پر کوئی حرج نہیں اگر تم (ان دودھ پلانے والیوں کو) دستور کے مطابق وہ ادا کرو جو تم نے انھیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

سیاق کلام میں یہ آیات احکام مفارقت کے ضمن میں آئی ہیں، یعنی طلاق کے بعد

اگر مرد عدت کے ختم ہونے تک عورت کو آزاد کرنے ہی کا فیصلہ کرتا ہے اور عورت اس کے کسی بچے کو دودھ پلا رہی ہے تو اس صورت میں مرد پر اپنی مطلقہ کے کھانے اور کپڑے لتے کا خرچ فراہم کرنے کی ذمہ داری ہوگی۔ غور کیجیے تو اس معاملے میں پہلی، دوسری یا تیسری طلاق سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ان احکام کا ہر حال میں لحاظ کرنا ہوگا۔

ظاہر ہے، رضاعت کی صورت میں مرد پر عورت کے نان و نفقے کی ذمہ داری اسی لیے ڈالی گئی ہے کہ عورت اس کے بچے کی غذا فراہم کر رہی ہے۔ یہی معاملہ حمل کی حالت میں بھی پیش آتا ہے۔ اس وجہ سے تیسری طلاق کے بعد اگر عورت حاملہ ہو تو شوہر پر اسے اپنے گھر میں رکھنے کی ذمہ داری تو عائد نہیں ہوتی، مگر اسے اپنی حیثیت کے مطابق مطلقہ کا نان و نفقہ بہر حال فراہم کرنا ہوگا۔

چنانچہ تیسری طلاق کے بعد کسی صورت میں بھی مرد پر اپنی مطلقہ کو گھر میں رکھنے کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی[۲۸] البتہ اگر عورت حاملہ ہو تو جب تک وہ بچے کی غذا فراہم کرے گی، اس وقت تک مرد پر اس کے نان و نفقے کی ذمہ داری عائد ہوگی۔

روایات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تیسری طلاق کے بعد عورت کو سکنیٰ اور نفقہ کا حق دار نہیں ٹھہرایا۔ امام مسلم کی روایت ہے:

۲۸؎ اگر عورت کے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں ہے تو اس کی کفالت اور اس کے رہنے کے لیے جگہ فراہم کرنا اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہوگی۔

عن الشعبی قال: دخلت علی فاطمة بنت قیس فسألتها عن قضاء رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم علیها فقالت: طلقها زوجها البتة فقالت: فخاصمته إلی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم فی السکنٰی والنفقة قالت: فلم یجعل لی سکنٰی ولا نفقة وأمرنی أن أعتد فی بیت ابن أم مکتوم. (رقم ۲۷۱۵)

''شعبی کہتے ہیں: میں فاطمہ بنت قیس کے پاس اس فیصلے کے بارے میں پوچھنے گیا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے خلاف فرمایا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے خاوند نے انھیں تیسری طلاق دے دی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس، سکنیٰ اور نفقہ کے بارے میں، اس کے خلاف اپنا مقدمہ لے کر حاضر ہوئیں۔ آپ نے انھیں نہ سکنیٰ کا حق دار ٹھہرایا، نہ نفقے کا، اور انھیں حکم دیا کہ وہ ابن ام مکتوم کے گھر جا کر اپنی عدت گزاریں۔''

اسی طرح نسائی کی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إنما النفقة والسکنٰی للمرأة إذا کان لزوجها علیها الرجعة. (رقم ۳۳۵۰)

''نفقہ اور سکنیٰ تو اسی عورت کا حق ہیں جس کا خاوند رجوع کر سکتا ہو۔''

سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۳۳ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ عورت کے نان و نفقے

کی ذمہ داری مرد کی حیثیت اور معاشرے کے معروف کے مطابق ہونی چاہیے۔ چنانچہ اگر نان ونفقے کی مقدار کے بارے میں مرد وعورت میں اختلاف ہو جائے تو اس مسئلے کے حل کے لیے معاشرے اور عدالت سے رجوع کیا جائے گا۔ مزید براں اگر مرد و عورت باہمی رضامندی سے کسی اور عورت سے دودھ پلوانا چاہیں تو اس صورت میں قرآن مجید کی رو سے مرد پر اس دایہ کا معاوضہ ادا کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

و۔ مطلقہ عورتوں کے نکاح میں رکاوٹ ڈالنا

بعض خاندانوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ اگر ان کے اندر کوئی عورت بیاہی جا چکی ہو تو اس کے طلاق پا جانے یا بیوہ ہو جانے کے بعد بھی یہ بات برداشت نہیں کی جاتی کہ وہ کہیں اور نکاح کرے۔ اس میں وہ لوگ اپنی توہین سمجھتے اور اس وجہ سے طرح طرح سے رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی بات کے پیش نظر قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں سختی کے ساتھ، اس سے روک دیا ہے کہ عورت کی عدت گزرنے کے بعد اس کے نکاح میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ ڈالی جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ	''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو
اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ	اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس
يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا	بات میں مزاحم نہ بنو کہ وہ اپنے ہونے
بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ	والے شوہروں سے نکاح کریں، جبکہ وہ

بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. (البقرہ۲:۲۳۲)

آپس میں معاملہ دستور کے مطابق طے کریں۔ یہ نصیحت تم میں سے ان لوگوں کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہی تمھارے لیے زیادہ شایستہ اور پاکیزہ طریقہ ہے۔ اور اللہ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے۔''

اللہ تعالیٰ نے اس حکم کے بعد یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ دنیا میں اگرچہ عورتوں پر اس طرح کا ظلم پوشیدہ رہ سکتا ہے، مگر آخرت میں اس کی بڑی ہی سخت پکڑ ہوگی۔ چنانچہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر حقیقی ایمان رکھتے ہیں، انھیں ان نصیحتوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

اس آیت کے آخر میں 'ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ'[۲۹] کے الفاظ پر بھی خاص توجہ رہنی چاہیے۔ صاحب ''تدبر قرآن'' ان الفاظ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...اگر عورت کی حسب مرضی نکاح کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی گئی تو اس سے خاندان اور پھر معاشرے میں بہت سی برائیاں پھیلنے کے اندیشے ہیں۔ یہیں سے خفیہ روابط، پھر زنا، پھر اغوا اور فرار کے بہت سے چور دروازے پیدا ہوتے ہیں اور ایک دن ان سب کی ناک کٹ کے رہتی ہے جو ناک ہی اونچی رکھنے کے زعم

۲۹ ''یہی تمھارے لیے زیادہ شایستہ اور پاکیزہ طریقہ ہے۔''

میں فطری جذبات کے مقابل میں بے ہودہ رسوم کی رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' (۱/۵۴۴-۵۴۵)

ز۔ معاشرے اور خاندان والوں کا کردار

یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ چونکہ اسلام میاں بیوی کے رشتے کو استحکام معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے، اس وجہ سے اس رشتے کے ٹوٹنے کو صرف اسی صورت میں گوارا کرتا ہے جب اصلاح احوال کی تمام ممکن تدابیر اختیار کر چکنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب اس کا جڑا رہنا ناممکن یا مزید فساد کا باعث ہوگا۔ چنانچہ قرآن مجید نے اصلاح احوال کے لیے میاں بیوی کے قبیلے، برادری اور ان کے رشتے داروں اور خیر خواہوں کو یہ ہدایت فرمائی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ سے اصلاح کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَیْنَهُمَا اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا. (النساء۴:۳۵)

''اور اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک حَکم مرد کے لوگوں میں سے مقرر کرو اور ایک عورت کے لوگوں میں سے۔ اگر دونوں (میاں بیوی) اصلاح کے طالب ہوئے تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا کر دے گا۔ بے شک،

اللہ علیم (اور) خبیر ہے۔''

یہ ہوسکتا ہے کہ رشتہ داروں اور خیر خواہوں کی مداخلت سے اصلاح احوال کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

یہ بات واضح رہے کہ دونوں حَکم اصلاح احوال ہی کی کوشش کرنے پر مامور ہیں نہ کہ طلاق کرانے پر۔ اگر ان کی مداخلت کے باوجود اصلاح کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی تو مرد طلاق دے سکتا ہے اور عورت چاہے تو خلع کے لیے عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔

خلاصۂ بحث

ان مباحث کے خاتمے پر ہم طلاق کے باب میں قرآن مجید کے اس قانون کا خلاصہ مختصر نکات کی صورت میں بیان کیے دیتے ہیں:

۱۔ جب کوئی شخص طلاق دینے کا فیصلہ کر لے تو اسے ایسے طہر میں ایک طلاق دینی چاہیے جس میں اس نے عورت کے ساتھ صحبت نہ کی ہو۔

۲۔ اس طلاق کے بعد عورت کو عدت گزارنی ہوگی۔ عدت کا عرصہ تین حیض ہوگا، الّا یہ کہ:

- عورت غیر مدخولہ ہو، اس صورت میں اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہوگی۔
- عورت کو حیض آنا بند ہو گیا ہو یا اسے حیض نہ آتا ہو، اس صورت میں اس کی عدت

تین ماہ ہوگی۔

o عورت حاملہ ہو، اس صورت میں اس کی عدت وضع حمل تک ہوگی۔

۳۔عدت کے دوران میں:

o عورت کسی سے نکاح نہیں کرسکتی۔

o عورت کے لیے حمل کا اخفا جائز نہیں۔

o مدت کا ٹھیک ٹھیک حساب رکھا جانا چاہیے۔

o مرد، عورت کو گھر سے نہیں نکال سکتا اور نہ عورت ہی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنا گھر چھوڑ کر جائے۔

o مرد، عورت کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اٹھائے گا۔

o مرد کو اگر اصلاح احوال کی توقع ہو تو وہ اپنے طلاق کے فیصلے سے رجوع کرسکتا ہے۔

۴۔اگر مرد تفریق کا فیصلہ کرتا ہے تو:

o اس کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عورت کو دی ہوئی کوئی بھی چیز، اس سے واپس لے۔ اس سے صرف دو صورتیں مستثنیٰ ہیں: ایک یہ کہ مرد صرف مال ہی کی وجہ سے طلاق دینے سے گریزاں ہے تو اس صورت میں عدالت اس کا کچھ مال اسے واپس دلا سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ عورت کسی کھلی بدکاری کی مرتکب ہوئی ہو۔

o اگر عورت کا مہر مقرر نہیں کیا گیا تو، خواہ مرد نے اس سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو،

اس کی فتوت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے کچھ دے دلا کر رخصت کرے۔

o اگر مہر مقرر ہو چکا ہو، مگر مرد و عورت نے زن و شو کا تعلق قائم نہ کیا ہو تو اس صورت میں مرد کے لیے مہر کی آدھی رقم ادا کرنی ضروری ہے، الّا یہ کہ عورت اسے بھی اپنی مرضی سے معاف کر دے اگرچہ مرد کی فتوت و مردانگی کا تقاضا ہے کہ وہ عورت کو مہر کی پوری ہی رقم ادا کر دے۔

o رخصت کرتے وقت عورت کو کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہیے۔

o عورت کے کسی اور کے ساتھ نکاح میں مرد کو یا کسی اور کو مزاحم ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

o عدت گزرنے کے بعد اگر عورت رضامند ہو تو مرد اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔

۵۔ اگر عدت کے دوران میں مرد رجوع کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو عورت اس کی بیوی ہے، اسے دوبارہ نکاح کرنے کی ضرورت نہیں۔

۶۔ عدت کے آخر تک مرد جو بھی فیصلہ کرے، اسے چاہیے کہ اس پر دو ثقہ افراد کو گواہ بنا لے۔

۷۔ اس طرح سے رجوع کر لینے کے بعد زندگی میں پھر کسی وجہ سے طلاق کی نوبت آ جائے تو شق ۱ سے ۶ تک بیان کردہ قانون پر اسی طرح عمل ہوگا۔

۸۔ اگر مرد دوسری مرتبہ بھی رجوع کا فیصلہ کرتا ہے اور پھر کسی وجہ سے تیسری مرتبہ

طلاق کی نوبت آ جاتی ہے تو اس طلاق کے بعد مرد عورت سے عدت کے دوران میں رجوع کا حق رکھتا ہے اور نہ اس سے دوبارہ نکاح ہی کر سکتا ہے، اس وجہ سے تیسری طلاق کے بعد مرد و عورت پر یکجا ایک ہی گھر میں رہنے کی ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی اور نہ اس عرصے میں مرد پر اپنی مطلقہ کا نان ونفقہ فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اب عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہے، الّا یہ کہ عورت کا کسی اور کے ساتھ نکاح ہو اور پھر اتفاقاً وہ شخص بھی عورت کو طلاق دے دے، تو اس طلاق کے بعد عورت کا پہلا شوہر اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کر سکتا ہے، بشرطیکہ فریقین کو یہ توقع ہو کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح سے نباہ کر سکیں گے۔

حاشیہ (بحوالہ ۲۰ ص ۲۰۳)

تیسری طلاق کے بعد عورت کے اپنے پہلے شوہر کے ساتھ نکاح کے لیے جائز ہونے کے معاملے میں فقہا نے مجامعت کی جو شرط لگائی ہے، اس کی اصل بنیاد ایک واقعے پر ہے۔

امام بخاری نے اپنی ''صحیح'' کی ''کتاب اللباس'' میں یہ واقعہ جس طرح نقل کیا ہے، ہمارے نزدیک اس معاملے میں اصل کی حیثیت اسی کو حاصل ہے۔ یہ روایت اس طرح ہے:

عن عکرمة أن رفاعة طلق — ''عکرمہ سے روایت ہے کہ رفاعہ

إمرأته فتزوجها عبد الرحمٰن بن الزبير القرظي قالت عائشة: و عليها خمار أخضر فشكت إليها و أرتها خضرة بجلدها، فلما جاء رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم و النساء ينصر بعضهن بعضًا، قالت عائشة: ما رأيت مثل ما يلقى المؤمنات لجلدها اشد خضرة من ثوبها، قال: وسمع أنها قد أتت رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم فجاء ومعه إبنان له من غيرها، قالت: واللّٰه ما لي إليه من ذنب إلا أن ما معه ليس باغني عني من هذه و أخذت هدبة من ثوبها، فقال: كذبت و اللّٰه يا رسول اللّٰه إني لأنفضها نفض الأديم، ولكنها ناشز

نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اس کے ساتھ عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی نے نکاح کرلیا۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ وہ سبز دوپٹا پہنے ان کے پاس آئی اور ان سے (اپنے شوہر کی) شکایت کی اور انھیں اپنے جسم پر نیل دکھائے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو چونکہ عورتیں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں، لہٰذا حضرت عائشہ نے کہا کہ میں نے کسی مسلمان عورت پر ایسا ظلم ہوتا نہیں دیکھا، اس کی جلد تو اس کے کپڑے سے بھی زیادہ سبز ہے۔ جب عبدالرحمٰن نے یہ سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی ہے، تو وہ اپنے دو بیٹوں کو، جو اس کی پہلی بیوی سے تھے، لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا۔ اس عورت نے کہا کہ خدا کی قسم،

ترید رفاعة فقال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه و سلم: فإن کان ذلك لم تحلی له أو لم تصلحی له حتی یذوق من عسیلتك قال: و أبصر معه إبنین له فقال: بنوك هؤلاء؟ قال: نعم، قال: هذا الذی تزعمین ما تزعمین؟ فواللّٰه لهم أشبه به من الغراب بالغراب. (رقم ۵۳۷۷)

مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، سوائے اس کے کہ ان سے میری تسلی نہیں ہوتی۔ پھر اس نے اپنے کپڑے کا ایک کنارہ پھندنے کی طرح پکڑا اور کہا: ان کے پاس جو کچھ ہے، وہ ایسا ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے کہا: یہ جھوٹی ہے، خدا کی قسم، یارسول اللہ، میں تو اس کا وہی حال کرتا ہوں جو دباغت دینے والا چمڑے کا کرتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ نافرمان ہے اور رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو تم رفاعہ کے لیے ہرگز حلال نہیں ہو، جب تک عبدالرحمٰن تمھارا مزہ چکھ نہ لے۔ پھر آپ نے عبدالرحمٰن کے دونوں صاحبزادوں کو دیکھ کر دریافت فرمایا: یہ تمھارے بیٹے ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا:

(اے عورت) تم نے جو کچھ کہا جھوٹ
کہا، حالاں کہ یہ دونوں عبدالرحمٰن کے
ساتھ اس سے زیادہ مشابہت رکھتے
ہیں جتنی ایک کوا دوسرے کے ساتھ
رکھتا ہے۔''

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ زمخشری نے اپنی تفسیر ''الکشاف'' میں اس طرح نقل کیا ہے:

وروی أنها لبثت ما شاء الله	''روایت کیا گیا ہے کہ وہ اسی طرح
ثم رجعت فقالت: إنه كان	رہی، جب تک اللہ نے چاہا۔ پھر وہ
قد مسنی فقال لها كذبت	(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) دوبارہ
فی قولك الأول فلن أصدقك	آئی اور کہا: اب اس نے میرے ساتھ
فی الآخر فلبثت حتی قبض	تعلق قائم کر لیا ہے۔ (نبی صلی اللہ
رسول الله صلی الله علیه	علیہ وسلم نے) فرمایا: تو نے پہلے جھوٹ
وسلم فأتت أبا بكر رضی	بولا، اب میں تیری بات پر ہرگز اعتبار
الله عنه فقالت: أأرجع إلی	نہیں کروں گا۔ چنانچہ وہ اسی طرح
زوجی الأول؟ فقال: قد	رہی، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ
عهدت رسول الله صلی الله	علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ تب وہ حضرت
علیه وسلم حین قال لك ما	ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئی اور

قال، فلا ترجعی إليه، فلما قبض أبو بكر رضی اللّٰه عنه قالت مثله لعمر رضی اللّٰه عنه فقال: إن أتيتنی بعد مرتك هذه لأرجمنك فمنعها.
(۲۷۵/۱)

دریافت کیا: کیا میں اپنے پہلے شوہر کے پاس جا سکتی ہوں؟ اس پر حضرت ابوبکر نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی تھا جب انھوں نے تمھارے بارے میں حکم دیا تھا۔ چنانچہ تم رفاعہ کے پاس نہیں لوٹ سکتیں۔ پھر جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو اس نے یہی سوال عمر رضی اللہ عنہ سے بھی کیا، انھوں نے فرمایا: اگر اس کے بعد تم میرے پاس آئی تو میں تمھیں رجم کرا دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے بھی اسے (رفاعہ کے پاس جانے سے) روک دیا۔''

فصل ۴: قضا کے مسائل

قرآن مجید اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی روشنی میں ہم نے پچھلی تین فصلوں میں اسلام کا قانون طلاق تفصیل کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ قرآن مجید کا یہ قانون بہت سادہ ہے اور ایک دفعہ سمجھ جانے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ

کوئی شخص اس سے عملاً انحراف کرے، مگر ہم جانتے ہیں کہ طلاق کا فیصلہ عام طور پر آدمی غصے اور جذبات کی حالت میں کرتا ہے جس کے باعث وہ بالعموم اس باب میں قرآن و سنت کے قوانین، پابندیوں اور حکمتوں کو فراموش کر دیتا ہے۔

اس فصل میں ہم اسلام کے قانون طلاق سے چند نمایاں عملی انحرافات، ان کے احکام اور ان کے ممکنہ تدارک کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کریں گے، مگر اس سے پہلے کہ اصل مسئلے پر بات شروع کی جائے، ہم یہ اصول واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ طلاق کے باب میں اصل قانون کی حیثیت قرآن وسنت کے انھی احکام کو حاصل ہے جن کا ذکر پچھلی تین فصلوں میں کیا جا چکا ہے۔ جہاں تک کسی قانون سے انحراف کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں فیصلہ کرنا اصلاً عدالت کا کام ہے۔ اس طرح کی کوئی صورت پیش آ جانے کے بعد اسے ریاست کی عدالت ہی کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے اور اس معاملے میں اسی کے فیصلے کو حتمی ماننا چاہیے، مگر ظاہر ہے، اس معاملے میں عدالت اور قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے عدل وانصاف سے فیصلہ کریں۔ قانون کے دائرے سے باہر نکل جانا کسی عدالت اور قاضی کے لیے جائز نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح کے مقدمات میں جو فیصلے فرمائے ہیں، وہ قاضی اور حکمرانوں ہی کی حیثیت سے فرمائے ہیں، شارع کی حیثیت سے نہیں فرمائے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فیصلے کہیں بھی قرآن مجید اور سنت ثابتہ سے متصادم نہیں ہیں، بلکہ غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ انھی کے مسلمات کی شرح و

وضاحت ہیں۔ چنانچہ ان مقدمات کے فیصلوں کو قانون سمجھ لینا یا قانون کا حصہ بنا دینا صحیح نہیں ہے۔ البتہ ان مقدمات سے ہمیں قانون کے وہ اصول سمجھ میں آتے ہیں جنھیں ایک پیغمبر نے اپنے فیصلوں کے ذریعے سے واضح فرمایا ہے اور جو ہر قانون دان اور قاضی کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم اسلام کے قانون طلاق سے کیے جانے والے چند نمایاں انحرافات، ان کے احکام اور ان کے ممکنہ تدارک کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر بحث کریں گے۔

۱۔ حیض[۳۰] میں یا ایسے طہر میں طلاق دینا جس میں زن وشو کا تعلق قائم ہوا ہو

ہم یہ بات پہلے واضح کر چکے ہیں کہ ایام حیض میں چونکہ مرد و عورت کے درمیان ایک نوعیت کا بُعد اور لاتعلقی پیدا ہو جاتی ہے، اس وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ عورت کے ان مخصوص دنوں میں طلاق نہ دی جائے۔ اسی طرح ہم یہ بات بھی واضح کر چکے ہیں کہ جس طہر میں مرد و عورت کے درمیان زن وشو کا تعلق قائم ہوا ہو، اس میں چونکہ عورت کے حاملہ یا غیر حاملہ ہونے کے بارے میں شبہ ہو سکتا

۳۰؎ حیض اور نفاس میں کوئی فرق نہیں ہے، اس وجہ سے اس معاملے میں بھی حیض اور نفاس کی ایک ہی حیثیت ہے۔

ہے جس کے باعث عدت کے عرصے میں فرق واقع ہو جاتا ہے، اس لیے اس معاملے میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ ایسے طہر میں طلاق نہ دی جائے جس میں شوہر اور بیوی نے تعلق قائم کیا ہو۔[۳۱]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان ہدایات کا خیال نہ رکھتے ہوئے حیض کے دنوں میں یا ایسے طہر میں، جبکہ اس نے بیوی کے ساتھ تعلق قائم کیا ہو، طلاق دے دیتا ہے تو کیا یہ طلاق واقع ہو جائے گی؟ مزید یہ کہ اس طرح طلاق دینے والے نے شریعت کے احکام کی جو خلاف ورزی کی ہے، کیا اس کے تدارک کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

کیا حیض یا جماع والے طہر میں دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی؟

اس معاملے میں سب سے پہلے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ شریعت میں ہر معاملے کے لیے کچھ ضروری شرائط ہیں جنھیں پورا کیے بغیر اس معاملے کی صحت اور اس کا وقوع ہی مشتبہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات و عبادات کے باب میں بہت سے ایسے احکام دیے ہیں جنھیں آداب کی حیثیت حاصل ہے۔ ہماری شریعت میں ان آداب کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ان آداب کا خیال رکھنے ہی سے آدمی احسان کا وہ درجہ حاصل کرتا ہے جو دین میں ہر ایک سے مطلوب

۳۱؎ حیض اور جماع والے طہر میں طلاق نہ دینے کی حکمت اور قرآن وسنت میں اس کی بنیاد پر ہم اس سے پہلے بحث کر چکے ہیں۔

ہے۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی عمل میں شریعت کے بتائے ہوئے ان آداب کا خیال نہیں رکھتا تو اگرچہ اس انحراف پر وہ عنداللہ مسئول ہوگا اور اگر ریاست چاہے تو اس کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی کی کوئی سزا بھی دے سکتی ہے، مگر یہ ایک عقلی تقاضا ہے کہ اس انحراف کے باوجود اس کے عمل کو واقع مانا جائے گا۔

طلاق کے باب میں ضروری شرائط دو ہی ہیں: ایک یہ کہ آدمی طلاق کا ارادہ رکھتا ہو اور دوسری یہ کہ وہ پورے شعور کے ساتھ اپنے اس ارادے کا اظہار کر دے[۳۲]۔ جہاں تک باقی احکام کا تعلق ہے تو وہ سب کے سب طلاق دینے کے آداب ہیں۔

آداب ہی کی نوعیت کے احکام کی ایک مثال اسی مضمون کی فصل ۳ میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ طلاق کی آیت ۲ میں مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران میں جب وہ اپنی بیویوں سے رجوع کرنے یا انھیں رخصت کر دینے کا فیصلہ کریں تو انھیں اپنے اس فیصلے پر دو ثقہ افراد گواہ بنا لینے چاہییں۔ ہم

۳۲؎ اگر یہ دو شرائط بھی پورے نہ ہوں تو اس صورت میں طلاق واقع نہیں ہوگی، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نابالغ کی طلاق نہیں ہوتی۔ اسی اصول پر آپ نے یہ بھی فرمایا کہ پاگل اور دیوانے کی طلاق بھی واقع نہیں ہوتی اور نہ ایسے لوگوں کی طلاق واقع ہوتی ہے جنھوں نے نشے کی حالت میں طلاق دی ہو یا جنھیں طلاق دینے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اسی اصول پر ہمارے نزدیک ان لوگوں کے بارے میں بھی یہی حکم ہوگا جو شدید غصے کی حالت میں طلاق دے بیٹھیں یا جن کی زبان سے بلا ارادہ طلاق کا لفظ نکل جائے وغیرہ۔

نے اس آیت کے احکام کی وضاحت کے بعد لکھا ہے: ''اگر کوئی شخص اس بات کا خیال نہیں رکھتا اور بغیر گواہوں کے اپنی بیوی سے رجوع کر لیتا یا اسے جدا کر دیتا ہے تو اگرچہ وہ اس ہدایت کی برکتوں سے محروم رہے گا، مگر ایسا نہ کرنے سے قانون کی نگاہ میں، اس کے فیصلے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

بعینہٖ یہی معاملہ حیض اور ایسے طہر میں طلاق دینے کا ہے جس میں شوہر اور بیوی نے آپس میں تعلق قائم کیا ہو، یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو حیض کے دنوں میں طلاق دے دے یا ایسے طہر میں طلاق دے دے جس میں اس نے مباشرت کی ہو تو اسلام کے قانون طلاق کی خلاف ورزی کے باوجود ایسا کرنے سے طلاق واقع ہو جائے گی۔

قانون سے انحراف کی تلافی

اس سلسلے میں اگلا مسئلہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اس طرح سے حیض یا جماع والے طہر میں طلاق دے دیتا ہے تو کیا اس کی اس غلطی کا تدارک ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس مسئلے میں بھی پہلے اصولی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اسلامی شریعت کا مزاج یہ ہے کہ قانون کے معاملے میں اگر کسی سے ایسی خلاف ورزی ہو جائے جس کی تلافی ممکن ہو تو خلاف ورزی کرنے والے کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ اپنے جرم یا غلطی کی تلافی کرے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص نماز میں کوئی ایسی غلطی کر بیٹھتا ہے جس کا تدارک ممکن ہے تو اس کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ

وہ اس غلطی کی تلافی کرے اور اس کے بعد سجدۂ سہو کر لے۔

ایک اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر کسی سے شریعت کے کسی حکم کی ایسی خلاف ورزی ہو جائے جس کا تدارک ممکن ہو تو وہ پورے زور سے اس خلاف ورزی کی تلافی کرے اور لوگوں کو صحیح راستے پر واپس لانے کی کوشش کرے۔

اس اصول کی بنیاد پر غور کیجیے تو حیض میں طلاق دینے کا تدارک یہی ہو سکتا ہے کہ طلاق دینے والے کو اس طلاق سے رجوع کرنے کو کہا جائے اور پھر اگر وہ چاہے تو قانون کے مطابق صحیح طریقے سے طلاق دینے کی ہدایت کی جائے۔

چنانچہ اگر کوئی شخص حیض یا جماع والے طہر میں عورت کو طلاق دے دیتا ہے تو عدالت یا قاضی کو اسے یہ حکم دینا چاہیے کہ وہ اپنی بیوی سے رجوع کرے اور پھر بیوی کے ان مخصوص ایام کے ختم ہو جانے کے بعد اگر چاہے تو اسے اسلام کے قانون کے مطابق طلاق دے۔

اسلامی احکام کو نظر انداز کرنے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کے معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ جب اس طرح کی خلاف ورزی کی تلافی ممکن ہو تو ریاست کی طرف سے خلاف ورزی کرنے والے کو ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حیض کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے تو آپ نے اسی اصول کے تحت انھیں اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حکم دیا۔ امام مسلم کی روایت ہے:

عن قتادة قال: سمعت يونس بن جبير قال: سمعت ابن عمر يقول: طلقت إمرأتي وهي حائض فأتى عمر النبي صلى الله عليه وسلم فذكر ذلك له فقال النبي صلى الله عليه وسلم: ليراجعها فإذا طهرت فإن شاء فليطلقها قال: فقلت لابن عمر: أفأحتسبت بها قال: ما يمنعه أرأيت إن عجز واستحمق؟ (رقم ۲۶۸۴)

''حضرت قتادہ سے روایت ہے کہ یونس ابن جبیر کہتے ہیں: میں نے ابن عمر (رضی اللہ عنہما) کو یہ کہتے سنا: میں نے اپنی بیوی کو اس حالت میں طلاق دی کہ وہ حائضہ تھی۔ اس پر عمر (رضی اللہ عنہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور ان سے اس بات کا ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: اسے چاہیے کہ اپنی بیوی کو لوٹائے، پھر اگر چاہے تو جب وہ (حیض سے) پاک ہو جائے، تب اسے طلاق دے۔ یونس کہتے ہیں: میں نے ابن عمر سے پوچھا: کیا آپ نے یہ طلاق شمار کی؟ انھوں نے جواب دیا: بھئی، اس میں کیا رکاوٹ تھی؟ (تمھارا کیا خیال ہے) ابن عمر شمار نہیں کر سکتا تھا یا احمق تھا؟''

اس روایت سے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، یہ واضح ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما نے حیض کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق

دے کر قانون کی خلاف ورزی کی ہے تو آپ نے انھیں حکم دیا کہ وہ اس خلاف ورزی کی تلافی کریں اور اپنی بیوی سے رجوع کر لیں۔ پھر اگر طلاق دینی ہی ہو تو قانون کے مطابق طہر میں طلاق دیں۔

اس روایت سے ہماری اس بات کی بھی تائید ہوتی ہے کہ اس طرح سے طلاق دینا اگرچہ صحیح نہیں، مگر اس سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ روایت کے آخر میں راوی کے استفسار پر یہی بات ابن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی کہی ہے کہ 'آخر یہ طلاق کیوں شمار نہ کی جائے گی؟ کیا اس لیے کہ ابن عمر احمق تھے یا اس لیے کہ انھیں شمار کرنا ہی نہیں آتا تھا؟'، یعنی یہ بات اتنی واضح ہے کہ اس طرح سے دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی، جو اسے شمار نہیں کرتا، وہ یا شمار کرنے ہی سے عاجز ہے یا احمق ہے۔

ہم شروع میں یہ بات عرض کر چکے ہیں کہ اسلامی ریاست ہر اس موقع پر قانون سے انحرافات کی تلافی پر مجبور کرے گی، جہاں ایسا کرنا ممکن ہو گا۔ ظاہر ہے، جن معاملات میں یہ تلافی ممکن ہی نہیں ہے، ان میں ریاست اگرچہ مجرم یا خطا کار کی تادیب کر سکتی ہے، مگر اس طرح کی کسی تلافی پر مجبور نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی کو اکٹھی تینوں طلاقیں یا تیسری طلاق دے دیتا ہے تو ظاہر ہے اب بیوی شوہر کے لیے حرام ہو گئی اور اس وجہ سے اسے اپنی بیوی سے رجوع کرنے اور اس طرح سے اپنے کیے کی تلافی کرنے کے لیے نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمر کو اپنی بیوی سے رجوع کرنے کا حکم دیا تو انھوں

نے اسی بات کی وضاحت چاہتے ہوئے پوچھا:

یا رسول اللّٰہ أرأیت لو طلقتها ثـلاثًا؟ قال: إذن عصیت ربك و بانت منك إمرأتك. (المغنی، ابن قدامہ ۷/۲۸۱)	''یارسول اللہ، اگر میں نے تین طلاقیں دے دی ہوتیں، تب آپ کیا فرماتے؟ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: اس صورت میں تم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی ہوتی اور تمھاری بیوی تم پر حرام ہوگئی ہوتی۔''

۲۔ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے دینا

طلاق کے بارے میں قرآن وسنت کے قانون کی شرح ووضاحت کرتے ہوئے ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں ان کے درمیان زن وشو کا تعلق قائم نہ ہوا ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک ساتھ تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے دیتا ہے تو کیا ایسا کرنا غلط ہوگا؟ مزید یہ کہ اس طرح طلاق دینے سے کیا تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی یا ایک ہی طلاق واقع قرار دی جائے گی؟

یہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلنا ہے

اس معاملے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن مجید[۳۳] اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے واضح احکام کی موجودگی میں جو شخص ایک ہی وقت میں اکٹھی تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے دیتا ہے، وہ اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلتا اور اس کے پیغمبر کے احکام کا مذاق اڑاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص کے بارے میں بتایا گیا کہ اس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ شدید غصے کے عالم میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

أيلعب بكتاب الله و أنا بين أظهركم حتى قام رجل وقال: يا رسول الله ألا أقتله؟ (نسائی، رقم ۳۳۴۸)

''میری موجودگی ہی میں اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے! (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ غصہ دیکھ کر) ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ، اگر آپ حکم دیں تو میں اسے قتل کر دوں؟''

اس وجہ سے، اگر مصلحت کا تقاضا ہو تو حکومت لوگوں کی اصلاح کرنے اور شریعت سے اس طرح کے انحرافات کی حوصلہ شکنی کرنے کے لیے کوئی سزا بھی دے سکتی ہے۔ چنانچہ اسی بات کے پیش نظر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اکٹھی تین طلاقیں دینے والوں کو سزا دی:

---

۳۳ تفصیل کے لیے اس مضمون کی فصل ۲ میں آیت 'طَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ' اور فصل ۳ میں آیت 'اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ' کے تحت کی گئی بحث پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

عن أنس أن عمر رضی اللّٰہ عنه کان إذا أتی برجل طلق إمرأته ثلاثًا أوجع ظهره. (اعلاء السنن، ظفر احمد عثمانی ۱۱/۱۴۳)

''حضرت انس سے روایت ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی ایسا آدمی لایا جاتا جس نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دی ہوتیں تو وہ اس کی پیٹھ پر کوڑے مارتے۔''

اوپر حیض اور جماع والے طہر میں طلاق دینے پر بحث کرتے ہوئے، ہم یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ طلاق کے باب میں وہ ضروری شرائط جنھیں پورا کیے بغیر طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، دو ہی ہیں: ایک یہ کہ آدمی طلاق کا ارادہ رکھتا ہو اور دوسری یہ کہ وہ پورے شعور کے ساتھ اپنے اس ارادے کا اظہار کر دے۔ جہاں تک باقی احکام کا تعلق ہے تو وہ سب کے سب طلاق دینے کے آداب ہیں۔ چنانچہ جس طرح حیض کے دنوں میں طلاق دینا، اگرچہ قانون کی خلاف ورزی ہے، مگر اس سے طلاق واقع ہو جاتی ہے، اسی طرح اکٹھی تین طلاقیں دینا بھی، جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہے، نہایت قابل مذمت ہے، مگر اس طریقے سے دی گئی طلاق کو یکسر کالعدم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

چنانچہ اس بارے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اکٹھی تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے دیتا ہے تو اس معاملے میں شریعت کی رو سے کیا اس کی تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی یا ایک ہی طلاق واقع مانی جائے گی؟

اس معاملے میں قضا کے اصول

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر زبان میں اعداد کا استعمال صرف شمار کرنے یا گننے کے لیے نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر 'سینکڑوں لوگ'، 'اربوں روپے' یا 'بیسوں مرتبہ' میں اعداد کا استعمال شمار کرنے کے لیے بھی ہوسکتا ہے اور بیان شدت، تکثیر یا اتمام وتکمیل کے لیے بھی، یعنی جب ہم کہتے ہیں: 'مجمع میں سینکڑوں لوگ موجود تھے' تو اس سے ضروری نہیں کہ یہی مراد ہو کہ ہم نے مجمع میں موجود لوگوں کو گنا ہے، بلکہ عموماً اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ مجمع میں بہت لوگ موجود تھے۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں: 'میں نے آپ کو یہ بات بیسوں دفعہ سمجھائی ہے' تو عموماً اس سے ہماری مراد یہ ہوتی ہے کہ ہم یہ بات اتنی مرتبہ سمجھا چکے ہیں جو ایک عاقل کو سمجھانے کے لیے کافی ہو۔ چنانچہ جس طرح ہم اعداد کو شمار کرنے یا گننے کے لیے استعمال کرتے ہیں، اسی طرح بیان شدت، بیان تکمیل، قطع عذر اور حتمیت وغیرہ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ اعداد کے اس استعمال کی طرح شدت، تکثیر یا اپنی بات کے اتمام کے لیے ہم ایک بات کو بار بار دہرا بھی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر غصے میں یا جھگڑتے ہوئے ایک شخص دوسرے کو کہتا ہے: 'جھوٹے ہو، تم بالکل جھوٹے ہو!'

بعینہٖ، یہی معاملہ طلاق میں تعدد کا بھی ہے، یعنی جب ایک شخص تین یا دس یا ہزار طلاقیں دیتا ہے تو اس سے اس کی مراد وہ تین طلاقیں بھی ہوسکتی ہیں جن کا حق قرآن مجید

نے اسے دیا ہے اور جن کے بعد اس کی بیوی اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے[۳۴]۔ اس کے برعکس، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ان اعداد سے اس کا ارادہ شمار کرنا یا گننا نہ ہو، بلکہ اس نے صرف اپنے غصے کے اظہار کے لیے یا اپنے فیصلے کی حتمیت بیان کرنے کے لیے یا بیان تکمیل کے لیے یہ اعداد بولے ہوں۔ مثال کے طور پر ایک شخص شدید غصے کے عالم میں اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر یا اپنے فیصلے کی قطعیت واضح کرنے کے لیے 'میں تمھیں طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں، طلاق دیتا ہوں' یا 'جاؤ تمھیں تین طلاقیں دیں' یا 'میں تمھیں دس ہزار طلاقیں دیتا ہوں' کہہ دیتا ہے یا ایک شخص اس ارادے سے یہ الفاظ بولتا ہے کہ اس کی بیوی پر یہ واضح ہو جائے کہ اس نے اس سے الگ ہونے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں چونکہ یہ خیال عام ہے کہ طلاق اس وقت تک پوری ہی نہیں ہوتی، جب تک تین طلاقیں نہ دی جائیں، اس وجہ سے ایک شخص اپنی طلاق کی تکمیل کے لیے بھی تین طلاقیں دے دیتا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک ہی وقت میں تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دینے سے یا بار بار طلاق کا لفظ بولنے سے یہ ضروری نہیں کہ آدمی طلاق ہی کے تعدد کا ارادہ رکھتا ہو۔ چنانچہ اس صورت میں یہ دیکھا جائے گا کہ تین یا تین سے

۳۴؎ تفصیل کے لیے اس مضمون کی فصل ۳ میں ''تیسری طلاق کے احکام'' پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

زیادہ طلاقیں دینے سے آدمی کا ارادہ کیا تھا، اگر اس کا ارادہ طلاقوں کا تعدد تھا، یعنی اس نے پورے شعور کے ساتھ وہ تین طلاقیں دے دی ہیں جن کا قرآن مجید نے اسے حق دیا ہے اور جن کے بعد اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے تین طلاقیں واقع ہو جائیں گی اور اس کے نتیجے میں اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اگر تین طلاقیں دینے سے یا طلاق کا لفظ بار بار دہرانے سے آدمی کا ارادہ طلاقوں کا تعدد یا انھیں شمار کرنا نہیں، بلکہ اپنے غصے کا اظہار کرنا یا اپنے فیصلے کی حتمیت واضح کرنا یا طلاق کی تکمیل کا تاثر دینا تھا تو اس صورت میں اس کی دی ہوئی طلاقوں کو ایک طلاق مانا جا سکتا ہے۔

قانون سازی کا مسئلہ

اسی ضمن میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ بات صحیح ہے کہ اکٹھی تین طلاقیں دینے سے تین طلاقیں واقع ہو سکتی ہیں اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی طلاق واقع ہو تو پھر اس معاملے میں ریاست کیا قانون بنائے گی؟

ہمارے نزدیک عدالت میں جب بھی کوئی ایسا مقدمہ پیش کیا جائے جس میں ایک شخص نے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہوں تو قاضی ایسا کرنے والے کو حلف دے کر اس کی نیت دریافت کرے۔ اگر اس کی نیت تعدد ہی کی ہے تو اس کی تین طلاقیں واقع مانی جائیں اور اگر اس کا ارادہ تعدد کا نہیں، بلکہ بیان شدت یا کسی بھی اور بات کا

ہے تو ایک طلاق واقع مان کر اسے رجوع کرنے کا حق دے دیا جائے۔

حدیث کا ذخیرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ آپ کے پاس اس طرح کا مقدمہ آیا تو آپ نے طلاق دینے والے سے حلف دے کر پوچھا کہ اس کا ارادہ واقعی تین طلاقیں دینے کا تھا یا صرف تاکید کی غرض سے اس نے طلاق میں تعدد کیا۔ پھر اگر اس نے قسم کھا کر یہ کہہ دیا کہ اس کا ارادہ ہرگز تین طلاقیں دینے کا نہیں تھا، صرف بیان شدت کے لیے اس نے یہ عدد بولے تھے تو آپ نے اسے رجوع کرنے کی اجازت بھی دے دی اور یہ بھی بتا دیا کہ اس سے ایک طلاق واقع ہوگئی ہے۔

اس ضمن میں حدیث کی کتابوں میں رکانہ بن عبد یزید کا واقعہ بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ تمام روایات جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہوا:

''رکانہ نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دیں۔ کچھ دیر بعد انھیں اپنے کیے پر افسوس ہوا[۳۵] اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ انھوں نے کس طرح طلاق دی ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ وہ ایک ہی وقت میں اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا: کیا اکٹھی تین طلاق دی ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا۔ آپ نے فرمایا: تمھارا ارادہ کیا تھا؟ انھوں نے کہا: میرا ارادہ تو صرف ایک طلاق دینے کا تھا۔ اس

۳۵ احمد، رقم ۲۳۸۷۔

پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ تمھارا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا؟ انھوں نے کہا: ہاں، میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، میرا ارادہ ایک ہی طلاق دینے کا تھا۔ آپ نے فرمایا: یہ بات ہے تو رجوع کر لو، یہ ایک ہی طلاق ہوئی۔[۳۶] انھوں نے عرض کیا: مگر یا رسول اللہ، میں نے تو تین طلاقیں دے دیں۔ آپ نے فرمایا: میں سمجھ گیا ہوں، تم رجوع کر لو۔ اور یاد رکھو، یہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔ دیکھو، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: 'اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ'[۳۷] (جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدت کے حساب سے طلاق دو)۔''

مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جب بھی اس طرح اکٹھی تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے دینے کا کوئی مقدمہ آتا تو آپ ہمیشہ انھیں ایک سمجھ کر رجوع کر لینے کی اجازت دے دیتے تھے۔ اس معاملے میں، جیسا کہ ہم نے واضح کیا، آپ کا طریقہ یہی تھا کہ طلاق دینے والے سے اس کی نیت کے بارے میں پوچھتے۔ اگر یہ معلوم ہوتا کہ اس کی نیت تین طلاقیں دینے ہی کی ہے تو آپ مفارقت کا حکم دے دیتے۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ جب ابن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دے دی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں رجوع

۳۶؎ ترمذی، رقم ۱۰۹۷۔

۳۷؎ ابوداؤد، رقم ۱۸۷۷۔

کرنے کا حکم دیا تو انھوں نے اسی بات کی وضاحت چاہتے ہوئے پوچھا:

یا رسول اللّٰہ أرأیت لو طلقتها ثلاثًا؟ قال: إذن عصیت ربك و بانت منك إمرأتك. (المغنی، ابن قدامہ ۷/۲۸۱)	''یارسول اللہ، اگر میں نے تین طلاقیں دے دی ہوتیں، تب آپ کیا فرماتے؟ (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے) فرمایا: اس صورت میں تم نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی ہوتی اور تمھاری بیوی تم پر حرام ہوگئی ہوتی۔''

چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کے استفسار پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات واضح فرمادی کہ جب ایک شخص جانتے بوجھتے اور پورے شعور کے ساتھ اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیتا ہے تو اس کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ابن قاسم نے ''المدونۃ الکبریٰ'' میں ابن مسیّب کے حوالے سے نقل کیا ہے:

إن رجلًا من أسلم طلق إمرأته علی عهد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم ثلاث تطلیقات جمیعًا فقال له بعض أصحابه: إن لك علیها رجعة فانطلقت إمرأته حتی دخلت علی	''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک نومسلم نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، تو اس کے کسی ساتھی نے اسے بتایا کہ وہ اب بھی رجوع کرسکتا ہے۔ اس کی بیوی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس

رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقالت: إن زوجی طلقنی ثلاث تطلیقات فی کلمة واحدة فقال لها رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: قد بنت منه ولا میراث بینکما. (۴۲۱/۵)

آئی اور عرض کیا: میرے شوہر نے مجھے اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں، آپ نے فرمایا: اب تم اس سے جدا ہوگئی اور اب تمھارے درمیان وراثت بھی نہیں ہوگی۔''

ان تمام واقعات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب کبھی اکٹھی تین طلاقیں دینے کا کوئی واقعہ ہوتا تو آپ یہ دیکھتے کہ طلاق دینے والے کا ارادہ کیا تھا، اگر یہ محسوس ہوتا کہ اس نے سوچ سمجھ کر ایسا کیا ہے اور تین طلاقیں دینا ہی اس کے پیش نظر تھا تو آپ یہ تین طلاقیں واقع مان کر مفارقت کرا دیتے[۳۸]۔ اس کے برعکس اگر یہ معلوم ہوتا کہ اس کا ارادہ تین طلاقیں دینے کا نہیں تھا، بلکہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر وہ ایسا کر گزرا ہے تو اسے رجوع کا حق دے کر اس کی ایک طلاق نافذ کر دیتے تھے۔

۳۸ ''المدونۃ الکبریٰ'' کے حوالے سے ہم نے جو واقعہ نقل کیا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد نے سوچ سمجھ کر تین طلاقیں دیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر اپنا مقدمہ پیش کرتا۔

اوپر کی ساری بحث سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ جب کسی معاملے میں دو یا دو سے زیادہ صورتوں کا امکان موجود ہو تو ہر مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت اس بات کو متعین کیا جانا چاہیے کہ اس خاص مقدمے میں ان ممکنہ صورتوں میں سے کون سی صورت کارفرما ہے۔ اس کے برعکس اس طرح کے معاملات میں ریاست کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ کسی قانونی، دینی، معاشرتی، اجتماعی یا کسی بھی اور مصلحت کے پیش نظر اگر وہ چاہے تو ان ممکنہ صورتوں میں سے کسی صورت کو پہلے سے متعین کر کے اس کے مطابق قانون سازی کر دے۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں ہمیں اپنے قانون میں بھی مل سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے ٹریفک قوانین کے مطابق ہر ڈرائیور یا گاڑی چلانے والے کے لیے ڈرائیونگ لائسنس اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ اب اگر کانسٹیبل کسی شخص کو گاڑی چلاتے ہوئے روکے اور اس سے اس کا لائسنس طلب کرے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اگرچہ وہ لائسنس یافتہ ہے، مگر اس وقت اس کے پاس اپنا لائسنس موجود نہ ہو۔ اس صورت میں ایک طریقہ یہ ہو سکتا تھا کہ کانسٹیبل گاڑی چلانے والے کا حلفیہ بیان لے کر اسے چھوڑ دے، مگر ہماری ریاست میں قانونی اور اجتماعی مصلحت کے پیش نظر یہ طے کر دیا گیا ہے کہ گاڑی چلاتے وقت ہر شخص کے پاس اپنا لائسنس موجود ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شخص اپنے پاس لائسنس رکھے بغیر گاڑی چلاتے ہوئے پکڑا جائے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ لائسنس یافتہ نہیں ہے اور قانون کی اس خلاف ورزی پر اس کا چالان کر دیا جائے گا۔ غور کیجیے تو اس کے برعکس ریاست میں یہ قانون بھی نافذ کیا جا سکتا تھا کہ ہر گاڑی چلانے والے

کے بارے میں اس وقت تک یہی سمجھا جائے گا کہ وہ لائسنس یافتہ ہے، جب تک وہ ٹریفک کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑا نہ جائے اور پھر اگر لائسنس یافتہ ہونے کے باوجود اس وقت اس کے پاس لائسنس موجود نہیں ہے تو اسے اپنا لائسنس فراہم کرنے کی مہلت دی جائے گی۔

چنانچہ اس طرح کی قانون سازی کا جو حق ریاست کے پاس موجود ہے، اس کے تحت اکٹھی تین یا تین سے زیادہ طلاقوں سے متعلق قانون سازی کے معاملے میں بھی اگر ریاست چاہے اور مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کا تقاضا سمجھے تو اس کی دو ممکنہ صورتوں میں سے کسی بھی صورت کو پہلے سے متعین کر کے اس کے مطابق قانون سازی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس اصول کے تحت ریاست کے پاس دو راستے ہیں: پہلا راستہ یہ ہے کہ جب بھی اکٹھی تین طلاقیں دینے کا کوئی واقعہ ہو، انھیں بیان عدد ہی پر محمول کیا جائے اور ہر حال میں تین طلاقیں نافذ کر دی جائیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس طرح کی قانون سازی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ اس کے نفاذ سے پہلے لوگوں کو اس بات سے باخبر کر دیا جائے کہ اگر آیندہ کسی شخص نے اس طرح اکٹھی تین طلاقیں دیں تو ان طلاقوں کو واقع مانا جائے گا اور اس کی بیوی ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہو جائے گی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں جب یہ دیکھا کہ اکٹھی تین طلاقیں دینے کے واقعات بہت بڑھ گئے ہیں اور لوگ قرآن مجید کے منشا کے خلاف، بلکہ نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں اللہ کی کتاب قرآن مجید سے کھیلتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے اکٹھی تین طلاقیں دے دیتے اور پھر جب ان کی نیت اور ارادے کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی بیویوں سے رجوع کر لیتے ہیں[۳۹]، تو انھوں نے مسلمانوں کی اخلاقی، معاشرتی اور اجتماعی مصلحت ملحوظ رکھتے ہوئے یہ فیصلہ سنا دیا کہ آیندہ جس نے بھی اس طرح اکٹھی طلاقیں دیں، اس کے اقدام کو بیان عدد پر محمول کرتے ہوئے تین طلاقیں واقع مان لی جائیں گی۔ امام مسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

فقال عمر بن الخطاب: إن الناس قد استعجلوا فی أمر قد کانت لهم فيه أناة فلو أمضيناه عليهم فأمضاه عليهم. (رقم ۲۶۸۹)

''عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے کہا: لوگ اس معاملے میں جلدی مچا رہے ہیں، جس میں انھیں احتیاط اور تحمل سے کام لینا چاہیے۔ تو کیوں نہ ہم ان پر یہ (تین طلاقیں) نافذ کر دیں۔ لہٰذا آپ نے ان پر یہ (تین طلاقیں) نافذ کر دیں۔''

۳۹؎ شوکانی نے اپنی کتاب ''نیل الاوطار'' میں بعض تابعین کے حوالے سے حضرت عمر کے اس فیصلے کی یہی توجیہ نقل کی ہے۔ (کتاب الطلاق باب ماجاء فی طلاق البتۃ وجمع الثلاث و إختیار تفریقها)

اس کے برعکس ریاست کے پاس قانون سازی کے لیے دوسرا راستہ یہ ہے کہ جب یہ محسوس ہو کہ اکٹھی تین طلاقیں دینے کے واقعات اگرچہ بہت بڑھ گئے ہیں، مگر مسلمانوں کی اکثریت چونکہ قرآن مجید کے قانون طلاق سے ناواقف ہے، اس وجہ سے اکٹھی طلاقیں دینے کے ہر واقعے میں تعدد کو بیان شدت یا تکمیل ہی پر محمول کیا جانا چاہیے۔ تو ہمارے بیان کردہ اصول کے تحت اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اس قانون کے تحت اکٹھی تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دینے کے ہر واقعے میں، ایک ہی طلاق واقع مانی جائے گی اور شوہر کو رجوع کر لینے کا حق دے دیا جائے گا۔ یہ بات ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ قانون سے انحرافات کی حوصلہ شکنی کرنے اور صحیح بات کی تعلیم دینے کے لیے اگر حکومت چاہے تو اس طرح کے انحرافات پر جرم یا غلطی کرنے والے کو سزا بھی دے سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک ان میں سے جو راستہ پارلیمان میں کثرت رائے سے طے کر دیا جائے، اسے ریاست میں قانون کی حیثیت سے جاری کیا جا سکتا ہے۔ ھذا ما عندی و العلم عند اللّٰہ۔

[۱۹۹۳ء]

تیسری طلاق کے احکام

اسلام کے قانون طلاق کے مطابق نکاح کے بعد مرد کو دو مرتبہ یہ حق حاصل ہے کہ وہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران میں عورت کو لوٹا لے۔ اس کے علاوہ پہلی اور دوسری مرتبہ طلاق کے بعد مرد کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ عدت ختم ہونے کے بعد اگر عورت راضی ہو تو اس سے دوبارہ نکاح کر لے۔[1] اگر کوئی شخص ایک مرتبہ طلاق دینے کے بعد عدت کے دوران میں اپنی بیوی کو لوٹا لیتا ہے اور پھر کسی وجہ سے زندگی میں دوبارہ طلاق دیتا ہے اور اسی طرح عدت کے دوران میں لوٹا لیتا ہے اور اس کے بعد پھر کسی وجہ سے اسے تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دیتا ہے تو اس صورت میں قرآن مجید اس شخص پر اس کی بیوی کو قطعی طور پر حرام کر دیتا ہے۔ اب یہ شخص اپنی بیوی کو لوٹا سکتا ہے اور نہ اس سے دوبارہ نکاح ہی کر سکتا ہے۔ اس معاملے میں قرآن مجید نے، البتہ ایک خاص صورت بیان کی ہے، جس کے پیش آ جانے کے بعد فریقین ایک مرتبہ پھر

[1] تفصیل کے لیے ''کتاب الطلاق'' پر نظر ڈال لیجیے۔

عقد نکاح میں بندھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ. (البقرہ۲:۲۳۰)

''پھر اگر وہ (ان دو طلاقوں کے بعد) اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد، اس کے لیے جائز نہیں، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے، پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ مراجعت کر لیں، اگر وہ توقع رکھتے ہوں کہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں۔''

قرآن مجید کے اس بیان کے مطابق تیسری طلاق کے بعد مرد کے لیے اس کی یہ مطلقہ بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اب یہ عورت کسی اور شخص سے تو نکاح کر سکتی ہے، مگر اپنے پہلے شوہر سے نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد کسی وجہ سے اگر اس کا دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دیتا ہے[۲] یا اس شخص کا انتقال ہو جاتا ہے تو پھر یہ عورت اور اس کا پہلا

۲؎ اس طلاق کے بعد بھی وہ تمام احکام اسی طرح سے جاری ہوں گے، جس طرح پہلے شوہر سے طلاق کے موقع پر ہوئے تھے، یعنی یہ کہ طلاق کے بعد عورت اپنے حالات کے لحاظ سے عدت گزارے گی۔ اس عدت کے دوران میں عورت کسی سے نکاح نہیں کرے گی اور مرد کو یہ

شوہر دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں[۳]۔ اس طرح دوبارہ نکاح کرنے کی اجازت قرآن مجید نے اس بات سے مشروط کر دی ہے کہ یہ نکاح اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب فریقین یہ سمجھتے ہوں کہ اب وہ باہم حسن سلوک کے ساتھ زندگی گزار سکتے اور اس طرح اپنی ازدواجی زندگی میں اللہ کے حدود کے پابند رہ سکتے ہیں۔

تیسری طلاق کے بعد فریقین کے ملاپ میں یہ پابندیاں عائد کرنے کی حکمت یہ ہے کہ طلاق بچوں کا کھیل بن کر نہ رہ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ پابندی لگا دینے کے بعد اب جو شخص بھی اپنی بیوی کو تیسری بار طلاق دے گا، وہ خوب سوچ سمجھ کر ایسا کرے گا اور اسلام کا منشا بھی یہی ہے کہ جو بھی طلاق دے، وہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر اور دور تک سارے نتائج سامنے رکھ کر ہی ایسا کرے۔

حلالہ

جیسا کہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں، قرآن مجید کے مطابق اگر ایک شخص اپنی بیوی کو

حق حاصل ہوگا کہ وہ اس سے رجوع کر لے، وغیرہ۔

[۳] اگرچہ قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق اگر دوسرا شوہر عورت کو طلاق دے تب عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہوتی ہے، لیکن عورت اگر کسی اور مرد سے نکاح کرے اور کچھ عرصے بعد مرد کا انتقال ہو جائے تو اشتراک علت کی وجہ سے اس صورت میں بھی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حرام نہیں رہے گی۔

تیسری طلاق بھی دے دے، تو اب وہ اس سے صرف اس صورت میں نکاح کر سکتا ہے کہ وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور پھر کسی وجہ سے اس کا یہ دوسرا شوہر بھی اسے طلاق دے دے۔

اگر کوئی مرد و عورت اس نیت سے نکاح کریں کہ اس نکاح کے بعد مرد عورت کو طلاق دے کر اسے اس کے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے کا حیلہ فراہم کرے تو اس کے لیے 'حلالہ' کی اصطلاح مستعمل ہے۔

اوپر ہم نے سورۂ بقرہ کی جس آیت کا حوالہ دیا ہے، اس میں 'تَنۡکِحَ' یعنی نکاح کا فعل استعمال ہوا ہے۔ لفظ نکاح، شریعت اسلامی کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق مرد و عورت کے اس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جس میں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بھر کے نباہ کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر زندگی بھر کے نباہ کا یہ ارادہ کسی نکاح میں نہیں پایا جاتا تو وہ نکاح نہیں، بلکہ ایک ایسی سازش ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ نکاح کی اصل فطرت یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کے سنجوگ کے ارادے کے ساتھ عمل میں آئے۔ یہ ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایک دوسرے کو محض جنسی تسکین فراہم کرنے کا معاہدہ نہیں ہے، بلکہ اس کے نتیجے میں مرد شوہر کی حیثیت سے عورت کے حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گزارنے کا معاہدہ کرتا اور عورت بیوی کی حیثیت سے مرد کے حقوق ادا کرتے ہوئے ساری زندگی گزارنے کا اقرار کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اولاد کی نعمت سے نوازے تو مرد ان

کے باپ کا کردار ادا کرنے کا عہد کرتا اور عورت ماں کے فرائض ادا کرنے کا وعدہ کرتی ہے۔ ظاہر ہے، نکاح کے معاہدے میں یہ ساری ہی باتیں بالبداہت مضمر ہیں، اس وجہ سے کسی قسم کے وقتی معاہدے کو بہر حال 'نکاح' نہیں کہا جا سکتا۔

چنانچہ ہمارے نزدیک حلالہ قرآن مجید کے حکم حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ[۴] کے خلاف ہے اور اس کی اسلام میں قطعاً کوئی گنجایش نہیں ہے۔ جو شخص اس نیت سے کسی عورت کے ساتھ مل کر یہ سازش کرتا ہے کہ اس کے پہلے شوہر کے پاس واپس جانے میں اس کی مدد کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں وہ 'تیس مستعار' یعنی کرائے کے سانڈ کا کردار ادا کرتا ہے۔ اس طرح سے وہ اللہ کے قانون کی حکمت کو پامال کرتا، احکام شریعت میں حیلہ بازی کرتا اور قرآن مجید کی واضح آیات کا مذاق اڑاتا ہے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لعن اللّٰہ المحلل و المحلل لہ. (ابوداؤد، رقم ۲۰۷۸۔ ابن ماجہ، رقم ۱۹۳۶)	''حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، ان دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔''

اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام میں حلالہ قطعاً حرام ہے، اسی وجہ سے شریعت اسلامی کے احکام کے خلاف اس طرح کی سازش کرنے والوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سخت ترین سزا دینے کی وعید سنائی ہے۔ انھوں نے کہا:

---

[۴] البقرہ ۲: ۲۳۰۔ ''جب تک وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے۔''

لا أوتی بمحلل ولا محلل له إلا رجمتهما. (الکشاف، زمخشری ۲۷۶/۱)

''اگر میرے پاس کوئی حلالہ کرنے والا اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، لائے گئے تو میں ان دونوں کو لازماً رجم کردوں گا۔''

نکاح میں مباشرت یا وطی کی شرط

فقہا کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کر لیتی، اس وقت تک وہ اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ اس معاملے میں صرف سعید بن مسیّب کی یہ رائے ہے کہ مجرد نکاح سے عورت کی حرمت ختم ہو جاتی ہے۔

جن لوگوں نے عورت کے اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے میں جماع کو شرط مانا ہے، انھوں نے اپنی رائے کے حق میں تین اہم دلائل پیش کیے ہیں۔ فقہا کی اس رائے پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہم ان کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں۔

ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ قرآن کے حکم 'حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ' میں نکاح کی نسبت عورت کی طرف کی گئی ہے، یعنی یہ کہا گیا ہے کہ 'جب تک وہ (عورت) کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے'، جبکہ نکاح عورت نہیں، مرد کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں پر 'تَنۡکِحَ' سے مراد محض نکاح کرنا نہیں، بلکہ وطی کرنا ہے۔ گویا آیت کے معنی یہ ہیں: 'جب

تک عورت کسی دوسرے شوہر سے وطی نہ کر لے۔

ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ 'زَوْجًا غَیْرَہٗ' میں 'زوج' کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ بیاہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب 'تَنْکِحَ' سے مراد وطی ہی ہو سکتی ہے۔

ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ کچھ روایات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض عورتوں کو اپنے پہلے شوہروں کے پاس جانے سے اس وقت تک کے لیے روک دیا تھا، جب تک ان کے دوسرے شوہر ان سے جماع نہ کر لیں۔ اس ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ 'لا، حتی تذوقی عسیلته و یذوق عسیلتك[5]' کو کم و بیش تمام فقہا نے نقل کیا ہے۔

جہاں تک ان کی پہلی اور دوسری دلیل کا تعلق ہے، اس کا غلط ہونا خود قرآن مجید ہی سے ثابت ہو جاتا ہے۔ آیۂ زیر بحث کے صرف ایک آیت بعد، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ. (البقرہ ۲: ۲۳۲)	''اور جب تم عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر چکیں تو تم اس بات میں مزاحم نہ بنو کہ وہ اپنے (ہونے والے) شوہروں سے نکاح

۵ بخاری، رقم ۲۴۴۵۔ ''نہیں، (اس وقت تک تم اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس نہیں جا سکتی) جب تک تم اس کا مزہ نہ چکھ لو اور وہ تمھارا مزہ نہ چکھ لے۔''

کریں۔''

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس آیت میں بھی نکاح کے فعل کی نسبت عورتوں ہی کی طرف ہے اور 'زوج' ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مگر یہاں پر، ظاہر ہے 'تَنْکِحَ' سے کوئی بھی وطی مراد نہیں لے سکتا۔ اس سے مراد بہر حال نکاح کرنا ہی ہے۔

مزید یہ کہ جن حضرات نے 'تَنْکِحَ' کے فعل سے وطی اس لیے مراد لیا ہے کہ نکاح کے فعل کی نسبت عورت کی طرف درست نہیں، کیونکہ نکاح عورت نہیں، بلکہ مرد کرتا ہے، انھوں نے شاید اس بات پر غور نہیں کیا کہ وطی بھی عورت نہیں کرتی، مرد ہی کرتا ہے تو پھر وطی کے فعل کی نسبت عورت کی طرف کس طرح درست ہوگی۔

ان کی تیسری بات کا تجزیہ کرنے سے پہلے، ہم ایک اہم اصول کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں، وہ اصول یہ ہے کہ کسی قانون کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اس قانون کے اصل ماخذ سے رجوع کر کے یہ دیکھا جائے کہ اس میں اصلاً کیا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے بعد اگر ضروری ہو تو اس حکم کی روشنی میں کیے گئے فیصلوں کا بھی مطالعہ کیا جائے۔ اس مطالعے سے بارہا کسی قانون کی مخفی حکمتیں سمجھنے میں بڑی مدد مل جاتی ہے۔

مثال کے طور پر، اگر کوئی شخص پاکستان کے آئینی قوانین کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کا پہلا ماخذ خود پاکستان کا آئین ہونا چاہیے، لیکن وہ اگر اس کے برعکس آئینی معاملات میں عدالت عالیہ یا سپریم کورٹ کے فیصلوں کو اپنا اصل ماخذ بنا لے تو یقیناً وہ اس سے اپنے لیے بہت سی پریشانیوں کے اسباب فراہم کر لے گا اور قانون کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ

سکے گا۔ مثلاً وہ عدالت عالیہ کے فیصلوں سے اگر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ صدر پاکستان اگر قومی وصوبائی اسمبلیوں کو ان کی میعاد سے پہلے ختم کرنے کے احکام جاری کر دے تو اس کے بارے میں ملک کا آئین کیا کہتا ہے؟ تو یقیناً وہ عجیب قسم کی الجھن میں پڑ جائے گا۔ وہ کہیں عدالت کو صدر مملکت کے حکم کی توثیق کرتے ہوئے پائے گا اور کہیں اسمبلیوں کو بحال کرتے ہوئے۔ اس کے نتیجے میں، ہوسکتا ہے کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جائے کہ اس معاملے میں پاکستان میں کوئی قانون نہیں ہے، یہ محض عدالت ہی کے اختیار پر منحصر ہے، وہ جو فیصلہ چاہے، کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے، اس کا یہ نتیجہ بالکل غلط ہو گا، لیکن اس کی یہ غلطی محض قانون کے استنباط کی غلطی نہیں ہے، بلکہ اس کا وہ طریقہ ہی غلط ہے جس سے اس نے قانون کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اسے کرنا یہ چاہیے تھا کہ وہ سب سے پہلے پاکستان کے آئین کا مطالعہ کرتا اور یہ سمجھتا کہ اس معاملے میں اصل قانون کیا ہے۔ اس کے بعد اس قانون کی روشنی میں وہ عدالت عالیہ کے فیصلوں کا مطالعہ کرتا تو اسے کوئی بڑی الجھن پیش نہ آتی اور وہ بڑی آسانی سے یہ بھی سمجھ لیتا کہ پاکستان کی عدلیہ نے اس قانون کو کس طرح سمجھا ہے۔

بعینہٖ یہی معاملہ اسلامی احکام کے استنباط کا بھی ہے۔ ہمارے پاس اگر کوئی ایسی کتاب یا ایسا ذریعہ موجود ہے جسے ہم اسلامی قانون کا بنیادی ماخذ قرار دے سکتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اسی کی طرف رجوع کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ اس معاملے میں وہ کیا قانون دیتا ہے۔ اس کے بعد اس قانون کی روشنی میں یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف

مقدمات میں عدالت نے اس قانون کو کس طرح نافذ کیا ہے۔

ظاہر ہے، اسلامی قوانین کا سب سے پہلا اور بنیادی ماخذ اللہ کی کتاب قرآن مجید ہی ہے۔ چنانچہ اسلام کا کوئی قانون سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے قرآن مجید ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے حکم کو سمجھنا چاہیے۔ اس کے بعد قرآن مجید کے اس حکم کی روشنی میں یہ دیکھنا چاہیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقدمات میں اس قانون کو کس طرح نافذ کیا ہے۔

ہمارے نزدیک زیر بحث مسئلے میں بھی[۶] اسلامی قانون کے استنباط میں وہی غلطی ہوئی ہے جس کی ہم نے نشان دہی کی۔ چنانچہ قرآن مجید کو بنیاد بنا کر اسلام کے قانون کو سمجھنے کے بجاے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو بنیاد بنا کر اس سے قرآن مجید کے حکم کو سمجھنے اور اسلامی قانون کو اخذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن مجید کے ایک عام لفظ 'تَنْکِحَ' کے معروف معنی نکاح کرنا، چھوڑ کر 'وطی کرنا' لینے پڑے اور 'زَوْجًا غَیْرَہٗ' کے واضح معنی لینے کے بجاے منطقی قسم کا استدلال کرنا پڑا۔ پھر اسی وجہ سے حلالہ کی شرط سے کیا جانے والا نکاح اگرچہ تمام فقہا کے نزدیک صحیح نہیں ہے، تاہم پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے میں دوسرے شوہر کے ساتھ وطی کی شرط

[۶] یعنی یہ کہ جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کر کے اس کے ساتھ مجامعت نہیں کر لیتی، اس وقت تک وہ اپنے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ گویا پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے میں نکاح کے ساتھ ساتھ دوسرے شوہر کے ساتھ مباشرت کرنا بھی لازم ہے۔

تمام فقہا نے عائد کر دی ہے۔ اس سے ایک عجیب و غریب صورت پیدا ہو گئی ہے۔ سادہ الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ حلالہ کی شرط سے نکاح کرنا تو صحیح نہیں ہے، مگر حلالہ کی نیت سے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ وطی کرنا صحیح ہے۔ یا یوں کہیے کہ حلالہ کی شرط مذکور ہو گی تو نکاح صحیح نہیں ہو گا اور یہی شرط مذکور ہونے کے بجائے فریقین کی نیت میں موجود ہو گی تو اس سے یہ قبیح فعل جائز ہو جائے گا۔ کیا اس سے خدا کی شریعت میں حیلے بازی کا دروازہ نہیں کھل جائے گا؟ کیا اس سے آپ حلالہ کرنے اور کرانے والے کے ہاتھ میں سند جواز نہیں تھما دیں گے؟ اور کیا اس کے نتیجے میں کتاب اللہ کے واضح احکام کو مذاق نہیں بنا لیا جائے گا؟

ہمارے نزدیک، اگر صحیح طریقے سے غور کیا جاتا تو اس مسئلے کی حقیقت سمجھنے میں کوئی مشکل نہ ہوتی۔ اصل بات، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، صرف یہ ہے کہ متفرق قسم کی روایات سے اسلام کا قانون اخذ کرنے کے بجائے کتاب اللہ کی واضح آیات سے قانون اخذ کیا جائے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں کو اس واضح قانون کی روشنی میں سمجھا جائے۔

مسئلہ: قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید پر غور کیجیے تو وہ اس مسئلے کے بارے میں کہتا ہے:

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ ''پھر اگر وہ (ان دو طلاقوں کے بعد)

بَعۡدُ حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ فَاِنۡ طَلَّقَھَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡھِمَآ اَنۡ یَّتَرَاجَعَآ اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ یُّقِیۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰہِ. (البقرہ۲:۲۳۰)

اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں ہے، یہاں تک کہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح کرے۔ پھر اگر وہ اسے طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کر لیں، اگر توقع رکھتے ہوں کہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں۔''

قرآن مجید کی اس آیت میں 'حَتّٰی تَنۡکِحَ زَوۡجًا غَیۡرَہٗ' یعنی 'جب تک وہ کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کر لے' کے الفاظ آئے ہیں۔ ہم اوپر یہ واضح کر چکے ہیں کہ لفظ 'نکاح' شریعت کی ایک معروف اصطلاح ہے جس کا اطلاق مرد و عورت کے اس ازدواجی معاہدے پر ہوتا ہے جس میں میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بھر کے نباہ کا ارادہ پایا جاتا ہو۔ اگر زندگی بھر کے نباہ کا یہ ارادہ کسی نکاح میں نہیں پایا جاتا تو وہ سرے سے نکاح ہی نہیں ہے، اس وجہ سے اس کی اسلام میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اسی وجہ سے، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، حلالہ کی نیت سے کسی عورت کے ساتھ نکاح کا ڈھونگ رچانے کی اسلام میں ہرگز کوئی گنجایش نہیں۔ دوسری طرف نکاح کے لفظ میں یہ بات بھی بالبداہت مضمر ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان میاں

اور بیوی کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ عام حالات میں اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک مرد اور ایک عورت نکاح کے رشتے میں بندھنے کے بعد ازدواجی تعلق قائم نہ کریں۔ یہ بہرحال ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو غیر معمولی حالات ہی میں پیش آ سکتا ہے۔ چنانچہ نکاح کے بعد وطی یا جماع کا حکم قرآن کی کسی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زن وشو کا یہ تعلق نکاح کی فطرت ہی میں موجود ہے۔ البتہ یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ زن وشو کے اس تعلق سے پہلے اگر طلاق ہو جاتی ہے تو کیا اس سے نکاح کی صحت پر کچھ اثر پڑے گا؟ ہمارے نزدیک اس سے نکاح کی صحت پر بہرحال کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس بات کی دلیل خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ ارشاد باری ہے:

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ. (البقرہ ۲:۲۳۶)

''(ان عورتوں کے مہر کے باب میں) تم پر کوئی گناہ نہیں جنھیں تم ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو''

ظاہر ہے، نکاح میں اگر صحبت یا مباشرت کو شرط کی حیثیت حاصل ہوتی تو یقیناً قرآن مجید اس مقام پر اس بات کو واضح کر دیتا۔ اس کے برعکس، اس آیت میں غیر مدخولہ مطلقات کے نکاح کو ہرگز باطل قرار نہیں دیا گیا ہے۔

اس کے بعد سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۳۰ کے بقیہ حصے 'فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ' پر نظر ڈالیے تو اس سے بھی ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ غور

کیجیے، یہاں 'اِنْ طَلَّقَهَا' کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی لفظ 'اِنْ' کے استعمال پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''...عربی زبان میں 'اِنْ' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں 'اذا' ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۶۳۸)

چنانچہ 'اِنْ طَلَّقَهَا' میں لفظ 'اِنْ' کے استعمال سے یہ بات بھی شامل ہوگئی ہے کہ دوسرا شوہر اگر طلاق دے تو کسی ناگہانی صورت ہی کے پیش آ جانے کی وجہ سے طلاق دے۔ ان الفاظ کے استعمال سے عورت کا اپنے پہلے شوہر کے پاس لوٹنے کے لیے دوسرے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرنا یا دوسرے کا اس وجہ سے طلاق دینا کہ عورت اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکے، اس آیت کے حکم سے خارج ہو گیا ہے۔

اس ساری بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید کے قانون کے مطابق اگر ایک شوہر اپنی بیوی کو زندگی میں تیسری مرتبہ بھی طلاق دے دے تو اس کے بعد وہ عورت اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حرمت سے ایک ایسی مخصوص صورت کو مستثنیٰ رکھا ہے جو شاذ حالات ہی میں کسی کی زندگی میں کبھی پیش آ سکتی ہے۔ وہ صورت یہ ہے کہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کرے اور پھر وہ مرد بھی

لے ''پھر اگر وہ (دوسرا شوہر) اسے طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کر لیں۔''

کسی ناگہانی صورت کے پیش آ جانے کی وجہ سے اسے طلاق دے دے تو اب کسی موقع پر اگر وہ عورت اور اس کا پہلا شوہر یہ محسوس کریں کہ وہ اچھے طریقے سے نباہ کر سکتے ہیں تو انھیں پھر سے ایک دوسرے کے ساتھ نکاح کرنے کی اجازت ہے، اس میں، البتہ دو باتیں خاص طور پر واضح رہنی چاہییں:

۱۔ ایک یہ کہ عورت کا دوسرے شخص کے ساتھ نکاح فی الواقع نکاح ہو۔ یہ عورت کو اپنے پہلے شوہر کے پاس لوٹانے کی کوئی سازش نہ ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ دوسرے شوہر سے طلاق کا واقعہ بھی ایک ناگہانی واقعہ ہو۔ اس وقت بھی عورت کے پیش نظر نہ اپنے پہلے شوہر کے پاس لوٹنا ہو اور نہ دوسرا شوہر ہی عورت کو یہ موقع فراہم کرنا چاہتا ہو۔

تمام حالات اور قرائن سے اگر معلوم ہو کہ ان دونوں شرطوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے تو اس کے بعد کسی قسم کی مزید تحقیق ہرگز نہیں کی جائے گی۔ نہ عورت سے یہ پوچھا جائے گا کہ اس کا اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم ہوا تھا یا نہیں اور نہ مرد ہی سے اس طرح کا کوئی فضول سوال کیا جائے گا۔

مثال کے طور پر، ایک عورت کو تیسری طلاق ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی عدت پوری کر لینے کے بعد دو سال تک اپنے والدین کے گھر بیٹھی رہتی ہے۔ دو سال کے بعد اس کے ساتھ ایک شخص نکاح کر لیتا ہے۔ پانچ سال تک وہ اس کے نکاح میں رہتی ہے۔ اس دوران میں ان کی کوئی اولاد نہیں ہوتی۔ پانچ سال کے بعد وہ شخص مر جاتا

ہے یا کسی جھگڑے کی وجہ سے وہ بھی اسے طلاق دے دیتا ہے۔ اس کے بعد مزید ایک سال کی مدت اسی طرح گزر جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کا پہلا شوہر اسے نکاح کا پیغام بھیجتا ہے جسے وہ قبول کر لیتی ہے۔

اس ساری صورت حال کو سامنے رکھیے تو کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس عورت نے اپنے پہلے شوہر کے پاس لوٹنے کے لیے دوسرے شخص سے نکاح کیا یا اس سے طلاق لی تھی۔ چنانچہ اس صورت حال میں یہ تحقیق ہرگز نہیں کی جائے گی کہ اس عورت کا دوسرے شخص کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم ہوا تھا یا نہیں۔

اس کے برعکس، ایک دوسری صورت حال کا تصور کیجیے۔ ایک عورت کو اس کا شوہر تیسری طلاق دے دیتا ہے۔ اپنی عدت پوری کرنے کے فوراً بعد وہ اپنے پہلے شوہر کے ایک دوست کے ساتھ نکاح کرتی ہے۔ دس دن بعد وہ شخص بھی اسے طلاق دے دیتا ہے۔ عورت اس طلاق کی عدت پوری کرنے کے فوراً بعد اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے، اس صورت حال میں ہر شخص کا ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ اس عورت نے دوسرا نکاح صرف اس وجہ سے کیا تھا تاکہ وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکے۔ چنانچہ مزید تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع ایسا ہی ہوا تھا۔ یہ بات ثابت ہو جانے کے بعد اس تحقیق کی پھر کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ عورت کا اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم ہوا تھا یا نہیں۔ ایک اسلامی ریاست کی عدالت اسے بہرحال اپنے پہلے شوہر کے پاس جانے سے نہ صرف روک سکتی ہے،

بلکہ شریعت اسلامی کا مذاق اڑانے پر اس سازش میں ملوث تمام افراد کو عبرت ناک سزا بھی دے سکتی ہے۔

قرآن مجید کے اس قانون کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایات میں کیا بات بیان ہوئی ہے۔

مسئلہ: روایات کی روشنی میں

زیر بحث مسئلے پر تمام روایات جمع کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مذکور اصل مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ عورت کا اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ زن وشو کا تعلق قائم ہوا تھا یا نہیں۔ ہمارے نزدیک ان روایات میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ عورت اپنے دوسرے شوہر سے طلاق لینا ہی اس وجہ سے چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جانے سے روک دیا۔

امام بخاری نے ''کتاب اللباس'' میں یہ واقعہ جس طرح نقل کیا ہے، ہمارے نزدیک اس معاملے میں اصل کی حیثیت اسی کو حاصل ہے۔ یہ روایت اس طرح ہے:

أخبرنا أیوب عن عکرمة أن	''ہمیں حضرت ایوب نے حضرت
رفاعة طلق إمرأته فتزوجها	عکرمہ سے روایت بیان کی ہے کہ رفاعہ
عبد الرحمٰن بن الزبیر القرظی	نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو اس

قالت عائشة: وعليها خمار أخضر فشكت إليها وأرتها خضرة بجلدها، فلما جاء النبي صلى الله عليه وسلم، والنساء ينصر بعضهن بعضًا، قالت عائشة: ما رأيت مثل ما يلقى المؤمنات لجلدها أشد خضرة من ثوبها، قال: و سمع أنها قد أتت رسول الله صلى الله عليه وسلم فجاء ومعه إبنان له من غيرها، قالت: والله ما لي إليه من ذنب إلا أن ما معه ليس بأغنى عني من هذه و أخذت هدبة من ثوبها، فقال: كذبت والله يارسول الله إني لأ نفضها نفض الأديم، ولكنها ناشز تريد رفاعة فقال رسول الله

کے ساتھ عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی نے نکاح کرلیا۔حضرت عائشہ فرماتی ہیں: وہ سبز دوپٹا پہنے ان کے پاس آئی اور ان سے اپنے شوہر کی شکایت کی اور انھیں اپنے جسم پر نیل دکھائے۔چونکہ عورتیں ایک دوسرے کی مدد کرتی ہیں، اس لیے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے کسی مسلمان عورت پر ایسا ظلم ہوتا نہیں دیکھا، اس کی جلد تو اس کے کپڑے سے بھی زیادہ سبز ہے۔جب عبدالرحمٰن نے یہ سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی ہے تو وہ اپنے دو بیٹوں کو، جو اس کی دوسری بیوی سے تھے، لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا۔اس عورت نے کہا کہ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں، سوائے اس کے کہ ان سے میری

صلى الله عليه و سلم: فإن كان ذلك لم تحلى له أو لم تصلحى له حتى يذوق من عسيلتك قال: و أبصر معه إبنين له فقال: بنوك هؤلاء؟ قال: نعم، قال: هذا الذى تزعمين ما تزعمين فو الله لهم أشبه به من الغراب بالغراب. (رقم ۵۳۷۷)

تسلی نہیں ہوتی۔ پھر اس نے اپنے کپڑے کا ایک کنارہ پھندنے کی طرح پکڑا اور کہا: ان کے پاس جو کچھ ہے، وہ ایسا ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے کہا: خدا کی قسم، یارسول اللہ، اس نے جھوٹ کہا، میں تو اس کا وہی حال کرتا ہوں جو دباغت دینے والا چمڑے کا کرتا ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ نافرمان ہے اور رفاعہ کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر یہ بات ہے تو تم رفاعہ کے لیے ہرگز حلال نہیں ہو، جب تک عبدالرحمٰن تمھارا مزہ نہ چکھ لے۔ پھر آپ نے عبدالرحمٰن کے دونوں بیٹوں کو دیکھ کر دریافت فرمایا: یہ تمھارے بیٹے ہیں؟ انھوں نے اثبات میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا: (اے عورت)، تم نے جو کچھ کہا، جھوٹ کہا، خدا کی

قسم، یہ دونوں عبدالرحمٰن کے ساتھ اس
سے زیادہ مشابہت رکھتے ہیں، جتنی
ایک کوا دوسرے کوے سے رکھتا ہے۔''

اس واقعے پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ عورت عبدالرحمٰن بن زبیر قرظی سے صرف اس وجہ سے طلاق لینا چاہتی ہے تاکہ وہ اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکے۔ اس نے پہلے طرح طرح کے بہانے بنا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا دل جیتنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ کے سامنے بھی اس نے یہ جھوٹ بولا کہ اس کا شوہر نامرد ہے۔ اس پر عبدالرحمٰن نے آپ سے عرض کی کہ وہ ہرگز نامرد نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرتا ہے کہ اس کا حال خراب ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد عبدالرحمٰن نے اس عورت کی نیت سے پردہ اٹھاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کہ وہ اصل میں اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جانا چاہتی ہے۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے روک دیا اور فرمایا: 'حتی یذوق عسیلتك' یعنی 'جب تک وہ تمھارا مزہ نہ چکھ لے'، اس وقت تک تم اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس نہیں جا سکتی۔ غور کیجیے، روایت کے سیاق و سباق میں اس جملے کے یہ معنی بالکل نہیں ہو سکتے کہ جب عبدالرحمٰن تمھارے ساتھ جماع کر لے، اس کے بعد تم اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جا سکتی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ عبدالرحمٰن کے الفاظ: 'کذبت واللّٰہ یا رسول اللّٰہ إنی لأ نفضھا نفض

الأدیم[۸]، خود یہ بتا رہے ہیں کہ ان دونوں کے درمیان زن وشو کا تعلق پہلے ہی قائم ہو چکا ہے۔ چنانچہ اس صورت میں آپ کے اس جملے کے معنی یا تو یہ ہو سکتے ہیں کہ اس وقت تک تم اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس نہیں جا سکتی، جب تک عبدالرحمٰن تمھارا پورا پورا مزہ نہ چکھ لے اور اپنی مرضی سے تمھیں طلاق نہ دے دے اور یا اس جملے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو اپنے پہلے شوہر کے پاس واپسی کو ایک ایسی چیز کے ساتھ مشروط کر دیا ہے جو اس عورت کے اپنے بیان (یعنی یہ کہ عبدالرحمٰن نامرد ہے) کے مطابق ناممکن ہے۔ گویا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے پہلے شوہر کے پاس کبھی واپس نہیں جا سکتی۔

اس کے علاوہ، روایات میں چند دوسرے واقعات بھی نقل ہوئے ہیں، مگر ان واقعات کی بہت زیادہ تفصیلات نقل نہیں ہوئیں، اس وجہ سے ان پر نہ بحث کی جا سکتی ہے اور نہ ان سے قانون کے استنباط میں کوئی بہت زیادہ مدد ملتی ہے۔ ہمارے نزدیک، اس باب کا سب سے اہم واقعہ یہی ہے۔ اکثر فقہا نے بھی اسی واقعے کو اصل کی حیثیت دی ہے۔ البتہ باقی تمام واقعات میں بھی قرائن اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عورت اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جانے کی غرض سے طلاق لینا چاہتی ہے، اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے سے اسے روک دیا ہے۔

۸۔ ''خدا کی قسم، یا رسول اللہ، اس نے جھوٹ کہا، میں تو اس کا وہی حال کرتا ہوں جو دباغت دینے والا چمڑے کا کرتا ہے۔''

اس نظر سے دیکھیے تو یہ اور اس جیسے دوسرے واقعات، نکاح میں جماع یا وطی کے شرط ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ قرآن مجید ہی کے حکم کا نفاذ ہیں۔ بے شک، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ فیصلے قرآن مجید ہی کی اساس پر قائم ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فیصلوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس بات پر اطمینان ہو جائے کہ عورت نے صرف اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے کی غرض سے نکاح کیا ہے یا صرف اسی وجہ سے وہ اپنے دوسرے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہے تو خواہ اس کے دوسرے شوہر نے اس سے صحبت کی ہو یا نہ کی ہو، عدالت اسے اپنے پہلے شوہر کے پاس واپس جانے سے بہر حال روک سکتی ہے۔

[۱۹۹۶ء]